علمی نقوش

از

(پروفیسر ڈاکٹر) غلام مصطفیٰ خاں
ایم۔ اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی
صدر شعبۂ اردو۔ سندھ یونی ورسٹی۔ حیدرآباد
(سابق صدر شعبۂ اردو۔ ناگ پور یونی ورسٹی)

سنہ ۱۹۵۷ء

 قیمت للعہ ر

علمی کتب خانہ۔ ناظم آباد۔ کراچی

ملنے کے پتے:- علمی کتب خانہ - ناظم آباد ۳ - کراچی
مکتبہ کارواں - انارکلی (ایبک روڈ) لاہور۔

⑦ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝[سنہ]

اُن تمام محترم بزرگوں کے نام

جن کی دعاؤں اور ہمت افزائی سے اس عاجز نے قلم پکڑنا سیکھا۔

پیراہنے کہ آید از و بوے یوسفم ترسم برادرانِ غیورش قبا کنند

— غلام مصطفیٰ خان :

سنہ اِن آیتوں کے اعداد ۱۹۱۲ سے میرا سالِ پیدائش ظاہر ہے۔

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

ان مضامین کی تحریک بعض ایسے بزرگوں کی دعاؤں اور شفقتوں کی رہین منت ہے جو میرے لیے والدین کی طرح مہربان رہے ہیں۔ والد مرحوم[لہ] کے انتقال کے ۳۲ سال بعد تک والدہ مرحومہ کی سخت تادیب لیکن بے پایاں شفقتوں سے نوازا گیا اور بچپن ہی سے بڑے بھائی حاجی نذیر احمد خاں صاحب نے اپنی محدود آمدنی کے باوجود مجھے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں ہائی اسکول سے لے کر ایم اے تک مولانا احسن مارہروی مرحوم اور پروفیسر ضیا احمد صاحب سے بھی مستفیض رہا۔ اور حضرت مولوی ضیاء الدین احمد الہ آبادی، مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری اور مولانا سلیمان اشرف رحمہم اللہ تعالیٰ کی خدمت میں بھی شرف یاب رہا۔ پھر نواب صدر یار جنگ اور علامہ سید سلیمان ندوی نے بار بار ملاقات اور نصف ملاقات میں بھی فرمایا کہ "لکھو اور لکھتے رہو" علامہ مرحوم نے تو یہاں تک ذرہ نوازی فرمائی کہ نقوش سلیمانی کے دوسرے ایڈیشن میں چار جگہ میرا حوالہ دیا۔ پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی صاحب اور علامہ پرنسپل محمد شفیع صاحب نے بھی کرم بخشی فرمائی

لہ والدین ماجدین مکرم کی تاریخیں یوں کہی ہیں:۔

بہ بہشت دل بجاں بادہ کرم حیّ ودود (۱۳۴۳ھ)

گلاب خاں بہشت جناں مقام گرد (۱۹۲۴ء) (رباعی مخرجہ)

اور پرنسپل صاحب موصوف نے انسائکلوپیڈیا آف اسلام (اُردو) کے لیے میرے متعدد مضامین منظور فرما کر حوصلہ افزائی فرمائی۔ افسوس کہ ان آخری دو بزرگوں اور پروفیسر ضیاء احمد صاحب کے علاوہ یہ تمام فضلا مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ اللہ پاک ان مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور جو بزرگ حیات ہیں اُن کو سلامت با کرامت رکھے۔ آمین! —— میری حوصلہ افزائی میں برادر محترم پروفیسر عبدالحمید جالندھری کا ہاتھ بھی ہے کہ انھوں نے میری ایک کتاب تاریخ بہرام شاہ غزنوی (انگریزی) اپنے صرفے سے شائع فرمائی ہے۔ جزاہ اللہ فی الدارین احسن الجزاء۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے ان بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں لیکن انھوں نے میری خامیاں نہیں دیکھیں، اس لیے ان مضامین کے تمام نقائص کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے، گو کہ وہ ملک کے بلند پایہ رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں تاہم وہ میری کوتاہیوں کی غمازی کرتے ہیں۔ آخر میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے اپنی تحریر کا ارتقا سمجھنے کے لیے زبان اور انداز بیان میں بھی عمداً نظر ثانی نہیں کی۔ اب پردہ پوشی اللہ کے ہاتھ ہے اَللّٰھُمَّ اسْتُرْنَا بِسِتْرِكَ الْجَمِيْلِ۔

اشاریہ اور پروف کی تصحیح عزیز مکرم پروفیسر مگی احمد ہاشمی صاحب کی عنایت ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵) والدہ الحاجہ محفوظ النساء صاحبہ (۱۳۷۶ھ)

اُمِّ بندہ حیف محفوظ النساء ہمدمِ بے چارگی مغموم رفت
حج، زیارت ہم عبادت روے داد سر بسر حق آشنا مرحوم رفت
دُر فشاں بر چشمۂ الطاف بود آنکہ از فضل الٰہ معصوم رفت

ہر پہلے مصرع سے ۱۳۷۶ھ اور ہر دوسرے مصرع سے ۱۹۵۶ء برآمد ہوتا ہے۔

ولی ویلوری کی تین مثنویاں[1]

یعنی

"ریاض الادب ولی ویلوری"

۱۳۵۷ھ

ولی ویلوری کی پہلی مثنوی گذشتہ سال عزیزی نعیم الدین[2] صاحب کے توسط سے ایک پرانی قلمی کتاب دیکھنے میں آئی۔ اس کے شروع اور آخر کے چند اوراق نہیں ہیں۔ بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ آخری تین چوتھائی حصے میں مثنوی روضۃ الشہدا ہے۔ جس کی مجلس دہم میں حضرت ہمل بن سعد رضی اللہ عنہ کے متعلق ۲۶ شعر ہیں، پھر "پیر معمر کی حکایت" کی سرخی ہے، لیکن اس کے بعد اشعار نہیں ہیں، اس مثنوی میں دس فصلیں ہیں اور ہر فصل کا نام مجلس ہے اور عموماً ہر مجلس کے آخر میں ولی کا تخلص موجود ہے، مثلاً :-

---

[1] معارف اعظم گڈھ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

[2] ماشاء اللہ اب ڈاکٹر ہیں اور ناگ پور یونی ورسٹی میں پروفیسر اردو ہیں۔

مجلس دوم میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا حال ہے۔ جسکے آخر میں ہے:۔

ولی توں بولنا صلوٰۃ ہر دم ۔۔۔ یہاں کر نامہ دوم کوں مختتم

مجلس چہارم کے آخر میں ہے:۔

ولی ہرگز نہیں اس غم کوں غایت ۔۔۔ توں کر صلوٰۃ سوں نامہ نہایت

مجلس پنجم کے آخر میں ہے:۔

ولی شاہِ ولایت سوں مدد منگ ۔۔۔ اتا کر مجلس ششم میں آہنگ
چھٹی مجلس کی کر اب عندلیبی ۔۔۔ سنا طفلاں یتیماں کی غریبی

مجلس ہفتم کے آخر میں ہے:۔

ولی یوں ذکر رکھ صلوٰۃ کوں بول ۔۔۔ زبان اب مجلس ہشتم منی کھول

مجلس نہم کے آخر میں ہے:۔

رہیا جیاں باقی ذکر عاشور ۔۔۔ دہم مجلس میں سب ہووے گا مذکور
ولی صلوٰۃ پر رکھ اس بیاں کوں ۔۔۔ دیکھاتی مہدی آخر زماں کوں

جناب حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے ولی دکنی (ویلوری) کے بیان میں ڈاکٹر ایتھے کے حوالے سے روضۃ الشہدا کے مضامین کی جو فہرست دی ہے اس کا مقابلہ جو اس قلمی مثنوی کے مضامین سے کر کے دیکھا تو معلوم ہوا۔ کہ بالکل وہی ہے۔ اور پھر ولی کے جو اشعار حکیم صاحب موصوف نے اردو ئے قدیم کے آخر میں مجلس سوم میں سے چن چن کر نقل کیے ہیں۔ ان کو اس

قلمی مثنوی کے اشعار سے ملایا، تو کامل یقین ہوا۔ کہ واقعی یہ وہی مثنوی ہے۔ اور یوں بھی اس کا یہی نام مثنوی کے شروع میں لکھا ہوا ہے یہ مثنوی غالباً بمبئی میں دو مرتبہ چھپ چکی ہے، لیکن میں نے مطبوعہ نہیں دیکھی،

روضۃ الانوار اسی قلمی نسخے کے شروع کے ایک چوتھائی حصے میں ایک دوسری مثنوی موسوم بہ روضۃ الانوار لکھی ہوئی ہے، اس کے متعلق میں نے مولانا عبدالحق صاحب اور علامہ سید سلیمان ندوی کے علاوہ اور صاحبان سے بھی معلوم کیا کہ شاید ہندوستان میں اس کا کوئی دوسرا قلمی نسخہ مل سکے لیکن معلوم ہوا کہ کہیں نہیں ہے، میرے پاس جو نسخہ ہے اس میں شروع کے چند اوراق نہیں ہیں، روضۃ الشہدا، کے مقابلہ میں (جس کے اشعار تقریباً ساڑھے سات ہزار ہیں)، یہ مثنوی تقریباً ایک تہائی ہے، آخر میں کل اشعار کی تعداد بھی دی گئی ہے۔ جو ۲۲۴۰ (دو ہزار دو سو چالیس) ہے، ہر صفحے پر عموماً ۱۶ شعر ہیں اور ہر ورق پر سلسلہ کے ساتھ اشعار کی تعداد بھی دیدی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع کے ۶۰ شعر اس مثنوی میں نہیں ہیں، کاش یہ اشعار کہیں ہوتے تو بہت سی ضروری باتیں شاید پردۂ خفا سے باہر آجاتیں، اس مثنوی روضۃ الانوار کے آخر کے چند اشعار یہ ہیں:۔

وداع کر ایک ایک خویشاں وہاں کے ۔۔۔ مدینہ پھر چلے مرسل جہاں کے

کہ جانے میں ہوا آزار آغاز ۔۔۔ کیے کوچ آخریں کھتیں سرافراز

بیاں دو روضۃ الشہدا میں ارقام ہوا یاں روضۃ الانوار اتمام

در و داں ہیں ہزاراں لک دمادم بر آں سر دفتر ایجاد عالم

ہوا تصنیف اس کا ہجرت سوں نبی کے باغ دیں میں بوج لے توں ۱۱۵۹ھ

ربیع الآخریں میں بیست یک کم ہوا یو نور کا نامہ متمم

پھر لکھا ہوا ہے :-

"چہار شنبہ بتاریخ ۱۹ شہر ربیع آخر سنہ ۱۱۵۹ھ"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصنیف کے ساتھ ہی اس کی کتابت بھی ہوئی۔

مذکورہ بالا اشعار کے پڑھنے سے چار باتیں معلوم ہوتی ہیں :-

۱۔ ان میں جو تیسرا شعر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روضۃ الشہدا اور روضۃ الانوار کا مصنف ایک ہی ہے۔

اسی شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے روضۃ الشہدا لکھی جا چکی تھی۔ اور اس کے بعد روضۃ الانوار لکھی گئی۔ ورنہ بغیر اس کے لکھے ہوئے اس کا اشارہ یہاں کرنا ہی فضول تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ روضۃ الشہدا سنہ ۱۱۵۹ھ سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی جس کے متعلق ہم آگے بحث کریں گے۔

۳۔ یہ مثنوی یہ روضۃ الانوار (چہار شنبہ) ۱۹ ربیع الآخر سنہ ۱۱۵۹ھ میں لکھی گئی۔

ہم بلفظ "روضۃ الانوار" اور آخر شعر کے آخر مصرع کے لفظ نور کا نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور وغیرہ سے متعلق ہے، اسی مضمون کے اشعار اس مثنوی میں ہیں، میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس مثنوی کے شروع کے ۶۰ شعر نہیں ہیں۔ تاہم اس کے بعد کے جو اشعار ملتے ہیں۔ ان سے بھی وہی مضمون سمجھ میں آتا ہے، یہ اشعار بہت مشکل سے پڑھے گئے، بعض الفاظ بالکل نہ پڑھے جا سکے،

میرا رزاق ہور بخشندۂ جاں	توں مار نہار ....
کہ اے نور حبیبیت سوں موصوف	ہے عارف توں پرستش ....
نشاں عارف کا ہے عشق و محبت	محبت کی نشانی ہے عبادت
پرستش کرمری تا ہوئے بنیاد	کہ عاشق کوں اول محبوب کا یاد
ہوا مشغول دیں اور نیک نامی	ہزار سترہ برس اندر میتامی
سنیا یک قبضۂ نور از نور ذاتی	ہر آں انوار ذاتی و صفاتی
وہ نور احمدی سجدہ بجا لائے	توجہ ہور نظر سوں فیض حق پائے
نماز صبح اس سجدہ بدل فرض	ہوا اس پر ہوا اس امت اپر فرض
یہی اُٹھ سترہ ہزاراں برس دیگر	کھڑیا خدمت میں او نور مطہر
جو نور خاص حق سوں پایا کو خلعت	گیا ہے سجدۂ ثانی تحیت
نماز ظہر ہو بھی فرض اس پر	ہور ان کی امتاں اوپر برابر

کیے ہیں پنج قیاماں اوا سی دہات — سو پائے پانچہ حق سوں یو علیات
جواب معہود پہ ہے سب پر موقت — اسی دن سوں ہے بنیاد سعادت
پچاسی الف برساں جب ہوئے پور — حکم آیا دوگانہ کا باں نور
بھی تکبیر تحریمہ الف سال — اسی دعا توں لیہر یک ارکان کا حال
رکوع و سجدہ و قعدہ با قیاماں — کہ قومہ ہور جلسہ با سلاماں

یہ سولہ شعر پہلے صفحے کے ہیں۔ اب سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، کہ اس سلسلہ کے جو ۲۶ شعر پہلے تھے وہ بھی نور نبوتی کی پیدائش وغیرہ کے متعلق رہے ہوں گے۔ ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے، کہ کلیات ولی اورنگ آبادی (مرتبہ استاذی حضرت احسن صاحب مارہروی دامت برکاتہ) میں جو پہلی مثنوی مناجات کے متعلق ہے اس کے اکتیس[۳۱] شعر اور دوسری مثنوی (در تعریف شہر سورت) کے کم از کم آخری تین شعر اس مثنوی روضۃ الانوار کے شروع میں رہے ہوں گے، جو زمانہ کی دست برد سے ایک لڑی سے بکھر گئے، کیونکہ بحر بالکل وہی ہے یعنی ہزج، مسدس، محذوف اور یہ متفرق اشعار بھی ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ ان میں عشق حقیقی کی طرف میلان ہے، جوش ہے، ولولہ ہے، گویا آنے والے نفس مضمون سے یہ اشعار متاثر ہیں، یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ اشعار براعۃ الاستہلال ہیں اور بے شک نور محمدی کی پیدائش، انوار جہاں افروزی سے متعلق ہیں۔

استاذی موصوف کا یہ خیال کہ مثنویات کے یہ ۸، شعر شاید مثنوی روضۃ الشہدا کی تمہید میں ہوں گے، (مقدمہ صفحہ ۹)، اب صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ روضۃ الشہدا ہمارے پیش نظر ہے اور اس کے شروع میں یہ شعر نہیں ہیں ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے، کیونکہ مثنوی روضۃ الشہدا کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے حال سے ہے، جس کی تمہید میں شاعر کا لہجہ پُر الم ہونا چاہیے اور مذکورہ ۸، شعروں میں یہ بات نہیں ہے، بہر حال اب بھی ہم ان اشعار کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے، بہت ممکن ہے (جیسا کہ نصیر الدین صاحب ہاشمی کا خیال ہے) کہ ولی اورنگ آبادی نے کسی مثنوی کو لکھنا شروع کیا ہو۔ لیکن وہ پھر مکمل نہ کر سکے ہوں،

اب میں مثنوی روضۃ الانوار کے مضامین کی فہرست ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

ذکرِ نورِ نبوی (یہ سرخی اس مخطوطہ میں نہیں ہے۔ مضمون کے اعتبار سے میں نے خود بنالی ہے)، ذکر عبد اللہ۔ ذکر حمل باندن آمینہ (اس نسخہ میں یہی لفظ ہے)، ذکر واقعات در مدت حمل آمینہ۔ ذکر ولادت حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔ باب در بیان شیر خوردن آں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔ در بیان سفرِ شام بار دوم بوکالت خدیجہ رضی اللہ عنہا (یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ سفرِ شام بار اول کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ کہ ولی ایک ہی سرخی میں کئی اور باتیں بھی بیان

کر گئے ہیں، اسی طرح پہلے سفر کے متعلق اس سے پہلے کے بیان میں لکھے گئے ہیں)

تقریب خواستگاری خدیجہ و ذکرِ تعداد اولاد النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم تعداد فرزندان و امہات المومنین رضی اللہ عنہم اجمعین، ذکرِ ابتدا وحی پیغمبر، اسلام امیر حمزہ اسلام آوردن عمر خطابؓ۔ ذکرِ دعوت اقربا، ہجرت کردن اصحاب رسول اللہ بار دوم جانب شام۔ ذکرِ شمائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ وفات حضرت بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ وفات ابو طالب (سال دوازدہم از نبوت)، در ذکر معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ تقریب مضمون رازہائے پنہانی۔ بیان فرمودنِ ذکر معراج و تصدیقِ دوستان و تکفیر نمودن و ابا و جفا، دشمنان۔ ذکر ہجرت نمودن از مکہ بہ مدینہ منورہ۔ ذکر نکاح ام حبیبہ بنتِ سفیان و آمدنِ ماریہ و فوت نجاشی۔ ذکر معجزات (چالیس معجزوں کا بیان ہے)، ذکر کشتی کردن با ابو جہل۔ ذکر جنگ بدر، ذکرِ جنگِ احد۔ جنگ سیوم احزاب۔ جنگ چہارم بنی قریظہ۔ جنگِ پنجم تبوک۔ ذکرِ افکِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔ جنگ ششم فتح خیبر۔ جنگ ہفتم فتحِ مکہ معظمہ۔ جنگ ہشتم فتح حنین۔ جنگِ نہم فتح طائف۔ ذکر حج الوداع۔

اس مثنوی کے شروع کے اشعار سے ولی کی زبان کی جھلک تو معلوم ہو چکی ہو گی، لیکن کچھ اور اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

(تقریب مضمون رازہائے پنہانی)

کیے یو نقل حضرت عمرؓ خطاب
ہوا معراج کا جس دن خوشی باب

کیا حضرتِ رسول اللہ سوں یو سوال
نہانی رازہا کا کچھ کرو قال

سو فرمائے کہ امت کا شکایت
کیا نجات یوں وو ربِ عزت

کہ عصیاں ورزہیں سب مل بجلوت
کریں وو انجمن میں سانی اطاعت

ولے میں پردہ پوشی میں ہوں ستار
ہوں دائم بخششِ رحمت سوں غفار

علیِ مرتضیٰ سوں ہے یو منقول
سخن اللہ از نہانی کا یو مدہول

گنہ کرتے تھے امتہائے پیشیں
عذاباں ترت ان پر تھے سو تعیینیں

کہ بعضے غرق ہو وو آبِ طوفاں
ہو کیتے آبِ رودِ نیل غرقاں۔

کتیاں کوں صیحہ جبریل سوں مار
ہوا بعضیاں اُپر بارانِ سنگبار

کیتے غرقِ زمیں ہیں مثل قاروں
چلے جاتے اجھوں تحت الثریٰ کوں

کیتاں کے تیں سو مسخِ صورتاں کر
ہوئے ملیٹ کیتے از بادِ صرصر

کیتاں کوں بھیں ہمیت اٹھا کو مارے
جہنم کے لئے وو باٹ سارے

ولیکن تجھ امت کوں یا محمدؐ
بدی ان کی کوں کر نیکی ستی رد

تری امت ہیں منجہ کوں بہوت پیاری
غضب ہور قہر سوں یو ہیں کناری

روایت یوں ہے از خاتونِ جنت
کہ یو تھے رازہائے با علیت

کہ میں ہوں ضامنِ رزقِ مقرر
ولے نیں اعتبار ان کا میرے پر

سدا ہیں رزق کے یو تنگ دوی میں
فکر سوں منتظر اس سنگ، ردی میں

بہشت ان کے نہیں کوں میں بنایا
سو یو سنتے ہیں یاں دوزخ کا پایا

نڈر کہ منجہ سوں لوکاں نن ڈریں یو ، جو خلوت میں گناہاں نت کریں یو
نہ مانگوں میں سبا کا آج اعمال یو مانگیں رزق ہفتہ ماہ ہور سال
میں ان کا رزق ان کوں دیوتا ہوں یو میری بندگی دیویں دوجی کوں
کہ لینی ہے ریا سوں اس سوں نیکی سو بے شک غیر کی ہے دو شریکی
ملائک ان کے بداعمال بردم کریں آ عرض منجہ سوں بیش ہور کم
کدھیں میں نیں کیا ان کی شکایت فرشتیاں کے ان کے ان کی مذمت
پڑے ان پو مصیبت گر ذرا بی ہوویں شکوہ منی کر اضطرابی
کرویں سب خلق کوں احوال ظاہر اپس کی قسمت اوپر نا ہو شاکر
تری امت کے کردارانِ شر میں نہ دیکھیا غیر عفو و در گذر میں
منجے لایا ہے کیا ہدیہ دنیا سوں کہے لایا ہوں دو چیزاں نپٹ دوں
یکے تقصیر امر بندگی ہے دوجی عصیان کی شرمندگی ہے
کیا تقصیر میں، رحمت ہے بھرپور شفاعت سوں تیری عصیاں گیا دور
کہے حضرت نبیؐ پھر عرض یوں واں کہ سب امت کو بخش اے پاک سبحاں
کہیا بخشیا یک حصہ آج کی رات قیامت کوں دو حصہ از شفاعت
ہوایاں مختصر معراج نامہ مطول سوں تھکیا تحریر خامہ

اب زبان کا پورا اندازہ ہو گیا ہو گا، لیکن چونکہ یہ مثنوی نایاب ہے اس لیے چند شعر اور سن لیجیے۔

(معجزہ کی دہشتم)

نبیؐ کے پاس آئے کافراں مل — طلب دھر معجزہ کا ہو کو یک دل

ہوا نے آستیں میں کھوڑ پھوڑ ایک — سو ہو کر متفق دل یک سوں جوڑ ایک

کہے گر شاہدی ہم اس سو پاویں — نبوت پر یقیں تب لے کو آویں

سیے آستیں سوں مجلس منیں ڈال — کہے دیو معجزہ اس سو کچھ فی الحال

نبیؐ فرمائے اس کوں اے جناور — توں اٹھ کر دے گواہی اس سکان

خدا کے حکم سوں وہ اٹھ کو دیں تد — کہیا سانچا رسول اللہ محمدؐ

پیمبر اس امت کا ہے یہ بے شک — قبول دیں اس کا سب یقیں اد کر

دیا حیوان مرنہ جب گواہی — ہوئے سب فیض منداں یاں پناہی

مثنوی روضۃ العقبیٰ

اب دلی کی تیسری مثنوی بھی معلوم کر لیجیے، جن اوراق میں مثنوی روضۃ الانوار لکھی ہوئی ہے، ان کے حاشیوں پر ایک اور مثنوی ہے، جس کا نام روضۃ العقبیٰ ہے، اور یہ مثنوی بھی دلی کی ہے، جیسا کہ آگے بتایا جائے گا۔ افسوس کہ حاشیہ آغاز یادہ کٹا ہوا ہے، کہ آدھے آدھے مصرعے نہیں ہیں، تاہم شروع اور آخر کے کچھ شعر جو پڑھے جا سکے ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے

ہو اللہ السمیع الحی و قادر — ہو الرب البصیر الباطن و ظاہر

هوالجبار و قہار و معدّل — هوالستار و غفار و مفضل

...... بخشندہ سزا کا مغفرت سوں — ...... جزا کا آخرت کوں

...... دے اذنِ شفاعت — ...... عاصیاں کے تئیں امیدِ جنت

آخر کے اشعار صاف اور پورے پورے ہیں۔

الٰہی تو اہے بینا و دانا — یو میری ضعفِ نیت پر متوانا

کیا تادیف یو میں مختصر قال — ترے محبوب پیغمبرؐ کا احوال

سو حالِ آخرت سب اس میں لایا — سکل خوف و رجایاں کوں سنایا

وعید و وعدہ لایا ہوں جمع کر — وعیداں سوں ڈریں وعدہ پو دل دھر

کیا نیں فارسی، دکھنی میں منظوم — کہ تا ہووے ہر یک کوں ترت معلوم

الٰہی تو اہے غفار و عطا کوش — صنیفاں کا غلط، سہو و خطا پوش

کتاب مطلع الانوار سوں دیک — کیا ہوں دو کتاباں نسخہ نیک

کہ یک ہے روضۃ الانوار اوّل — دو دیم یو روضۃ العقبیٰ ......

الٰہی دے لکھنہارے کے تیں ذوق — پڑھنہار و سنہارے کوں اہت شوق

لکھے اس کوں، پڑے اہنکر سناوے — کہ اس نسخہ کے تیں شہرت میں لاوے

سنے یو دل ہووے ہر ایک کا شاد — مصنف کوں کرے قل فاتحہ یاد

لکھیا کاغذ پو رہے یو تا قیامت — مصنف کا قل و الحمد اجرت

...... گیارہ سو نو بانسٹ ہجرتی سال — سنہ کم انو میں سوں فضلی کا اتھا حال

ہزار اوپر سہ صد پنجاہ ابیات ۔۔۔۔ دویم تاریخ ذی الحجہ کی جمعرات

ہوا یاں روضۃ العقبیٰ تماماں ۔۔۔۔ رسولؐ اللہ پہ صلوٰۃ وسلاماں

تمت تمام شد ۔۔۔۔ کار من نظام شد

"تمت" دویم ذی الحجہ ۱۱۶۲ھ روز پنجشنبہ مطابق ۱۱۵۹ فصلی،

چہارم ماہ آسوج کہ در ہند کوار گویند"

اس آخری عبارت سے بھی خیال ہوتا ہے کہ تصنیف کے ساتھ ہی کتابت ہوئی، ان آخری اشعار کے دیکھنے سے پانچ باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) جس طرح روضۃ الشہدا، اور روضۃ الانوار کا مصنف ایک ہی ہے اسی طرح روضۃ الانوار اور روضۃ العقبیٰ کا مصنف بھی ایک ہی ہے، یعنی ولی ہی نے یہ تینوں مثنویاں لکھی ہیں:۔

(۲) روضۃ الانوار اور روضۃ العقبیٰ کا ماخذ فارسی کتاب مطلع الانوار ہے جو شاید عرفی کی تصنیف ہے، خواجو کرمانی نے بھی ایک مثنوی روضۃ الانوار فارسی میں لکھی تھی، جو رام پور میں ہے، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ عرفی اور خواجو کرمانی کی تصنیفوں سے ہماری ان مثنویوں کو کوئی تعلق ہے یا نہیں ہے؟

(۳) ہم دیکھ چکے ہیں کہ روضۃ الانوار ۱۱۵۹ھ میں لکھی گئی تھی، اس کے تین سال بعد روضۃ العقبیٰ (۱۱۶۲ھ مطابق ۱۱۵۹ فصلی) لکھی گئی، جس میں ایک ہزار تین سو پچاس اشعار ہیں،

(۴) ان تین مثنویوں کے سلسلہ وار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ وجدی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ خاص مذہبی مذاق میں بسر کیا، اور اپنی شاعری سے دینی اور دنیوی دونوں فائدے حاصل کرنے کی کوشش کی۔

(۵) بہت ممکن ہے کہ یہ مثنویاں وجدی ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوں جو مسودہ ہو سکیں، کیونکہ ان کی اور نقلیں کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتیں اس نسخے میں کئی مقامات پر "لطفے" (اس طرح کے) دستخط موجود ہیں، بہت ممکن ہے کہ یہ دستخط وجدی ہی کے ہوں۔ اس کا کاغذ بھی بہت پرانا معلوم ہوتا ہے جو یقینی دو سو سال کا ہوگا۔ مثنوی روضۃ الانوار کے آخری الفاظ "چہار شنبہ بتاریخ ۱۹ ماہ ربیع آخر سنہ ۱۱۵۹ھ" اور مثنوی روضۃ العقبٰے کے آخری الفاظ "تمت تمام شد۔ کار من نظام شد، لطفے روز پنج شنبہ سنہ ۱۱۶۲ھ دوم ذی الحجہ ۱۱۵۰ فصلی چہارم ماہ آسوج کہ در ہند کوار گویند" کی تفصیل سے بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، خیر اس سے ہم کو بحث نہیں، اب ہم مثنوی روضۃ العقبٰے کے مضامین کی فہرست ذیل میں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ یہ مثنوی بھی خالص مذہبی رنگ میں ہے:۔

حمد خدا۔ نعت نبیؐ، مناقب خلفائے راشدینؓ، بیان سکرات موت بیان قبر، حکایت بخیل، ذکر قیامت، ذکر امام مہدی علیہ السلام، ذکر دجال ذکر حضرت عیسٰے صلوٰۃ اللہ علیہ وعلٰی نبینا والسلام، ذکر خروج یاجوج ماجوج،

ذکرِ فوت عیسے صلوٰۃ اللہ علی نبینا و علیہ، ذکرِ قیامت و نفخِ صور و احیاء اموات و حشر و قیام، ذکرِ خروج دابۃ الارض، ذکرِ طلوع شمس از مغرب، ذکرِ محاسبہ و محاسبہ و امتیازِ مومناں از کافراں، ذکرِ منافقاں و کافراں، اعتبارِ عیسے بن مریم و یہود و نصاریٰ، ذکرِ دیگر، ذکرِ دوزخ و پل صراط و گذشتن مومناں و افتادن کافراں دراں و احوال .... ذکرِ تعذیب عصاۃ مومناں و شفاعت انبیاء و رسل و ملائکہ، ذکرِ دخولِ جنت و درجاتِ مومناں،

چونکہ یہ مثنوی (درونحہ ب لفظی) حاشیہ پر ہے اور حاشیہ بہت زیادہ شکستہ اور کٹا ہوا ہے، اس لئے فی الحال ہم ضرور کچھ اور اشعار لکھ کر ختم کرتے ہیں۔ اگر ہو سکا تو پھر کبھی اس پر غور کیا جائے گا،

شفاعت کے بیان کے کچھ اشعار صاف پڑھے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں،

سو سب مل آئیں تو د حضرت آدمؑ
کہیں اے بڑے مہتر ہور مکرم

.... قدرت سوں تم ہیں آفریدہ
کہ مسجودِ ملک، جنت رسیدہ

.... سو ہم ہیں سب امیدواری
شفاعت آج تم کرنا ہماری

کہیں۔ میں ہوں گنہ گار مکمل
گنہ کا بیج ڈالیا پایہ اول

تھا مجھ کوں منع جانا جھاڑ کے پاس
سو کھایا توڑ دیک میٹھا خوش باس

نہ جرأت ہی کروں میں عرض حق سٹے
اسی شرمندگی سوں سرنگوں ہوں

سو جا کر نوحؑ سوں یو بات بولو
ضروری ہے غرض اس سات بولو

کہیں تب نوح سوں اے جدِ ثانی / اب طول العمر اے کشتی رانی

بھوت لاچار ہیں ہم بے وسیلہ / کرو تم کچھ شفاعت کا سو حیلہ

کہیں نوحِ نبی اے دیند اراں / تمن سوں میں ادک ہوں دلفگاراں

دعائے بد کیا میں آدمیاں کوں / کیا طوفاں تلف سارے جہاں کوں

کہ تھے اُنہا میں خلائق جیو جنتر / دواب و وحشی طیراں جناور

رہیا نیں نیک و بد کا کچھ وہاں فرق / کہ ایکچہ بار سب مل ہو گئے غرق

جیوں آٹے سات گھن پیسے گئے سب / پشیمانی سوں شرمندہ ہوں میں اب

سو ہُنجہ خجلت زدہ سوں نار کھو آس / تمیں جاؤ خلیل اللہ کے پاس

کہیں جا حضرت ابراہیم کے کن / کہ اے سردارِ ملت و دین روشن

کہ خلعت سوں ہے تمنا سرفرازی / شفاعت کی کرو کچھہ کارسازی

کہیں ہوں حق تعالیٰ سوں شرم (گیں) / کہ بولیا جھوٹ دنیا میانی (ہوں) تیں

اوّل ہوں میں کہیا بیمار سُستی / نہ تھا بیمار، تھا میں تندرستی

دوجا۔ سارہ کوں بولیا بھاں ہی گھر / کہ تھی عورت وو میری محرم مقرر

تیجا۔ سارے بتاں کو میں چہ توڑا / بڑے بت پر جھوٹا بہتان جوڑا

یو تینو میں گناہاں سوں ہوں حیراں / شفاعت دوسریاں کی میں کروں کاں

مگر موسیٰ کلیم اللہ ہے ایک / بہت گستاخ حق سوں لاڈلا، نیک

سو جا موسیٰ کنوں لا دیں التجا داں / کہے ہیں خون قبطی سوں پشیماں

تمیں عیسیٰ کنے، یو عرض لے جاؤ — کہ روح اللہ سوں یو آرزو پاؤ

کہ اے زندہ کن مردہ سہ صد سال — شفاعت کر یو وقتِ مشکل حال

کہے عیسیٰ کہ میری قوم بد تر — کیے فرزند خدا کا مُنجہ مقرر

خدا ہور میری ماں ہور تیسرا میں — کہے تینو خدایاں یو حیدا ئیں

پڑیا ہے اس خجالت میں میرا من — .....مل جائیں سب ختم النبیؐ کن؟

..... ہور جملہ انبیا سب ... — .... مصطفےٰ کن آئیں گے تب

.........آخر اسی جھنڈے تلے کام — شفیع محشر امت خاص ہور عام

یو سب مل کر کہیں گے یا محمدؐ — کہ کرتا نیں خدا تیرا سخن رد

کرم جو کچھ خدا کا ہے تیرے پر — ..... دونیں مرحمت بہ غیر دیگر

ہماری امتاں کی کر شفاعت — محمدؐ تب منگیں حق سوں اجازت

کہیں گے یا الٰہ ربِّ عزت — منگوں گستاخ ہو میں تیری خدمت

کہ عرضِ حال سب درماندگاں کا — کروں تشفیع امت راندگاں کا

سو آوے حکم سید مرسلیں کوں — تیرے بدلے کیا میں سب جہاں کوں

تیرے سوں ہوئی خدائی آشکارا — زمین و آسماں نقش و نگارا

نہ ہوتا توں تو کچھ درکار نیں تھا — نہ ہوتا توں تو کچھ سنسار نیں تھا

یو شور و غلغلہ غوغائے محشر — ....

تمہیں ہے سب کا سردار آج کے دن — تیرا ہے گرم بازار آج کے دن

تیری حاصل مراداں آج کے دن — تمہیں ہے فرح و شاداں آج کے دن

جو کچھ منگتا ہے منگ اے دوست میرے — کریں پوں سب رضامندی میں تیرے

نبی کوں جب ہووے اذنِ شفاعت — سو زیرِ عرش کر سجدہ بخدمت

جو سجدہ سوں اٹھا سر وو مکرم — کرے حمد و ثنا رب عالم

خداوندا یو ہیں مشتِ گنہ گار — پشیماں آپنی گفتار و کردار

اگر بخشے گا تو تو ہے سزاوار — جو رانے گا تو وو بندہ گنہ گار

جو دوزخ میں ہیں عاصی ہور پل پر — پڑے گی یک لکیر حد سرا سر

شفاعت سوں تیری اتنی ...... — سو پھر سجدہ کریں وو شاد جگ ...

سو ہووے حکم سجدہ سوں اٹھا سر — کیا میں مغفرت بھی اتنی ....

تجی سجدہ میں سب امت کوں بخشائیں — شفیع المذنبیں آرام تب پائیں

جب یہ معلوم ہو چکا کہ یہ تینوں مثنویاں ایک ہی شخص (ولی) کی لکھی ہوئی ہیں، تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کس ولی کو ان کے لکھنے کا فخر حاصل ہے۔ سب سے پہلے روضۃ الشہدا کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔ کلیاتِ ولی (مرتبہ استادی حضرت احسن مارہروی) کے طبع ہو جانے پر ایک مشہور محقق کو یہ خیال گذرا کہ مثنوی "دہ مجلس" ولی اورنگ آبادی کی تصنیف ہے اور روضۃ الشہدا ولی دکنی (ویلوری) کی ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مجمع النوادر کا نام چار مقالوں کی وجہ سے چہار مقالہ پڑ گیا۔ اسی طرح

مثنوی روضۃ الشہدار کا نام دس مجلسوں (فصلوں) کی وجہ سے "دہ مجلس" بھی ہے۔ کیونکہ اس نام کی کوئی مثنوی (روضۃ الشہدار سے مختلف اور اس کے علاوہ) کہیں موجود نہیں ہے۔

"اردوئے قدیم" میں غالباً ڈاکٹر اسپرنگر کے حوالہ سے یہ بتایا گیا ہے کہ روضۃ الشہدار کا سنہ تصنیف ۱۱۱۹ھ جو اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے:

کیا ہوں جب ختم یو درد کا حال — اگیارہ سو یو تھا انیسواں سال

میرے خیال میں یہ سنہ صحیح نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ جو مخطوطہ میرے پیش نظر ہے اُس کے آخر کے چند اوراق نہیں ہیں، ورنہ سنہ ضرور معلوم ہو سکتا۔ جناب حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے رسالہ اُردو (مورخہ اکتوبر ۱۹۲۸ء) میں کتب خانہ انڈیا آفس کے اردو مخطوطات کے متعلق پروفیسر بلوم ہارٹ کی فہرست کا جو اقتباس دیا ہے اس میں ولی کی روضۃ الشہدار کی تاریخ تصنیف ۱۱۳۰ھ ہے۔ (مکتوبہ پان گھاٹ ۱۲۱۶ھ۔ ۱۸۶ ورق) یعنی مذکورہ بالا تاریخ سے یہ تاریخ مختلف ہے۔ میرا خیال ہے کہ زیادہ معتبر تاریخ وہ ہے جو استاذی حضرت احسن مارہروی نے کلیاتِ ولی صفحہ ۳۸۶ میں لکھی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال — گیارہ سو یو تھا اکتالیسواں سال
کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول — "ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول"
۱۱۴۱ھ

مولانا عبدالجبار خاں صاحب ملکاپوری نے پہلے شعر کا دوسرا مصرع یوں لکھا ہے ع

"تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال"

بہر حال یہ مصرع صحیح ہو یا غلط، لیکن کم از کم دوسرے شعر کا دوسرا مصرع ہرگز غلط نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تاریخی مصرع ہے، جس سے ۱۱۴۱ھ نکلتا ہے۔ کلیاتِ ولی (مطبوعۂ مذکورہ) کے آخر میں مولانا عبدالحق صاحب نے دو ضمیمے بھی لگائے ہیں۔ دوسرا ضمیمہ اختلاف نسخ کا ہے۔ لیکن اس میں مذکورہ قطعۂ تاریخ کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ جس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ حضرت احسن کے نسخوں کے علاوہ اور جتنے نسخے مولانائے موصوف کی نظر سے گذرے، ان سب میں یہی قطعۂ تاریخ تھا، جسے شاید غلطی سے کسی کاتب نے اپنے نسخے میں ولی اورنگ آبادی کا سمجھ کر نقل کر لیا ہو۔ اور پھر دوسرے کاتبوں نے اس کی تقلید کی ہو، یا یہ کہ دو ولیوں کے ہمعصر ہونے کی وجہ سے اسی زمانہ میں کلام میں خلط ملط ہو گیا ہو۔ بہر حال مثنوی روضۃ الشہداء کی تاریخ ۱۱۱۹ھ یوں بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ۱۱۵۹ھ میں ولی نے روضۃ الانوار لکھی اور اُس کے تین سال کے بعد ۱۱۶۲ھ میں تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار کی مثنوی "روضۃ العقبیٰ" لکھی۔ اس لئے ایسے پر گو اور زود گو شاعر کے متعلق یہ خیال نہیں کیا

جاسکتا کہ وہ سنہ ۱۱۱۹ھ میں روضۃ الشہداء لکھ کر ۴۰ سال خاموش بیٹھا ہے اور پھر سنہ ۱۱۵۹ھ میں دوسری مثنوی لکھے۔ اور باوجود اس امتداد زمانہ کے زبان میں کوئی فرق نہ ہو۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ روضۃ الشہداء کی تاریخ سنہ ۱۱۴۱ھ ہی صحیح ہے۔ ہاں ایک بات سنہ ۱۱۱۹ھ کی موافقت میں یہ کہی جاسکتی ہے کہ شاید ولی نے اس سنہ میں روضۃ الشہداء لکھ کر پھر سنہ ۱۱۴۱ھ میں اس کی دوبارہ تصحیح و نظر ثانی کی ہو، اور اس وقت یہ قطعہ لکھ کر شامل کر دیا ہو۔ جو صورت بھی ہو اتنا ضرور ثابت ہے کہ روضۃ الشہداء سنہ ۱۱۴۱ھ میں اگر پہلی بار نہیں تو دوسری بار ضرور لکھی گئی۔ اس کے بعد سنہ ۱۱۵۹ھ میں روضۃ الانوار اور سنہ ۱۱۶۲ھ میں روضۃ العقبیٰ لکھی گئیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ تینوں مثنویاں ولی ویلوری کی ہیں۔ اور اس کیلیے یہ حسب ذیل ثبوت ہیں:-

(۱) جناب حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے اُردوئے قدیم میں ولی اورنگ آبادی کے حال میں لکھا ہے کہ "ہم نے دیوان ولی کا ایک قلمی نسخہ دیکھا ہے، جو ۵ رجادی الاول سنہ ۱۱۴۳ھ میں بمقام احمد آباد مکتوب ہوا ہے۔ اور اُس کے خاتمہ پہ یہ تحریر ہے:-

"تمام شد دیوان ولی رحمۃ اللہ علیہ"

اس جملہ سے ثابت ہے کہ ولی (اورنگ آبادی) نے سنہ ۱۱۴۳ھ سے پہلے وفات پائی۔ مذکورہ مثنویاں خصوصاً روضۃ العقبیٰ کی تاریخ سے

معلوم ہوتا ہے کہ دکنی کم از کم ۱۱۶۲ھ تک ضرور زندہ تھے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ وہ ولی جو ۱۱۴۳ھ سے پہلے قضا کر چکے تھے، ان تینوں مثنویوں کے مصنف نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ان کے مصنف دکنی ویلوری ہیں۔

(۲) حکیم صاحب موصوف نے رسالہ اردو (مورخہ اکتوبر ۱۹۲۸ء) میں بلوم ہارٹ کی فہرست کا جو اقتباس دیا ہے اس میں دیوان ولی کے ایک نسخہ کے کاتب کا نام سید محمد تقی ولد سید ابو المعالی ہے (مکتوبہ ۳۰ ذی القعدہ ۱۱۵۶ھ) اور یہ بھی لکھا ہے کہ سید محمد تقی کے والد وہی ابو المعالی ہیں جن کے ساتھ ولی (اورنگ آبادی) نے دہلی کی سیاحت کی تھی۔ اسی قلمی نسخہ کے آخر میں یہ عبارت ہے:۔

"تمت تمام شد دیوان مغفرت نشان ولی محمد مرحوم متوطن دکن بتاریخ دہم شہر ذی عقدہ ۱۱۵۶ھ روز پنجشنبہ بوقت صبح تحریر یافت مالک و کاتب این دیوان عاجز المذنب محمد تقی ولد سید ابو المعالی است کسے کہ دعویٰ کند باطل است"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے (۱) ولی اورنگ آبادی کا صحیح نام ولی محمد تھا۔ (۲) وہ دکن کے باشندے تھے۔ اور (۳) ۱۱۵۶ھ سے پہلے وہ ضرور انتقال کر چکے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید محمد تقی کے اس

---

[۱] اب ثابت ہو چکا کہ ولی دکنی گجراتی تھے اور ان کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا۔

قول سے زیادہ معتبر اور کوئی قول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کے والد سید ابوالمعالی سے ولی اورنگ آبادی کی دوستی تھی۔ اس تعلق کی وجہ سے ولی اورنگ آبادی کے متعلق جتنے معلومات سید محمد تقی کو ہو سکتے تھے اور کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتے تھے۔ بہرحال اتنا یقینی ثابت ہے کہ اگر ۱۱۴۳ھ سے قبل نہیں تو کم از کم ۱۱۵۶ھ سے پہلے ولی اورنگ آبادی ضرور انتقال کر چکے تھے۔ خواہ مولانا عبدالجبار صاحب ملکاپوری یا استاذی حضرت احسن صاحب مارہروی کے قول کے مطابق ۱۱۵۵ھ تک زندہ رہے ہوں۔ لیکن ہماری تین مذکورہ مثنویوں کی تاریخ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم ۱۱۶۲ھ تک جو ولی زندہ تھے وہ ولی ویلوری ہی ہو سکتے ہیں۔

ولی ویلوری کا مذہب

آخر میں چند باتیں اور عرض کرنی ہیں۔ کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" صفحہ ۳۵ میں ولی ویلوری کے متعلق ایک جگہ بتایا گیا ہے کہ وہ شیعہ مذہب تھے۔ دراصل مجھے کسی کے سنی یا شیعہ ہونے سے کوئی غرض نہیں۔ لیکن چونکہ یہ چیز اب تاریخی حیثیت رکھتی ہے اس لیے عرض کرنا پڑتا ہے کہ ولی ویلوری سنی ہی تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسی کتاب یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۳۶ میں ایک دوسری جگہ ولی ویلوری کا تعلق تصوف سے بتایا گیا ہے۔ اگر شیعہ کا صوفی ہونا ممکن ہے تو دوسرا ثبوت یہ ہے کہ روضۃ الشہداء کی مجلس چہارم کے

آخری حصّہ میں اکیس شعر ہیں جن کی سرخی یہ ہے :۔ "غم کردنِ معاویہ بزفوت امام حسن رضی اللہ عنہ" ان میں کے چند اشعار ذیل میں لکھے جاتے ہیں، جنھیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے :۔

کہیں بعضے یو فن چھند بند دستا | یو ظاہر باادب ہیں دست بستہ
اُنَن کے باپؓ کوں دی محنتِ سخت | لیا ہے ملک ان کا۔ تاج ہور تخت
بھی کرتے ہیں یو ظاہر کی خوشامد | کہ اس مکر و فریب دفن کوں نہیں حد
عقیدہ یو کرے سو ہے روافض | گمانِ بد، صحابی پر نجائز
وہی ہے مالک دل، عالم الغیب | ہیں بدظن ہو نا کرنا کسے عیب

ان میں چوتھا شعر قابل غور ہے۔ تنہا یہ شعر دکنی دلیوری کے مذہب کے فیصلہ کے متعلق کافی ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے اشعار ہیں جن میں حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ و عثمانؓ رضی اللہ عنہم کی منقبت پائی جاتی ہے۔ دوسری دونوں مثنویوں سے اس کی ایک ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ مثنوی روضۃ الانوار میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعہ میں پوری ایک فصل ہے جس میں پچاس سے زائد اشعار ہیں۔ ان کے اسلام قبول کرنے پر بہت خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور پھر یہ شعر ہیں :۔

بجل آیہا پو جب حضرت عمرؓ تب | کہے اہلِ قریش و شہر میں سب

نبیؐ کی میں غلامی میں ہوا اب | اگر دیکھے گا کوئی آنک اُچا اب
نکال آنک اُس کی دیں اس تھار مارو | قدم پر مصطفےٰؐ کی جیو کوں واروں
لگے کرنے نمازاں آشکارا | جماعت ہور اذاں کا ہو پکارا
نبوت سوں ستہ تھا یا چارداں سال | ہوئے حضرت عمرؓ یو دولت الیصال

مثنوی روضۃ العقبیٰ میں خلفائے راشدین کی مختصر منقبت ہے چنانچہ نعت کے بعد یہ اشعار ہیں:-

درود اں اس پو ہر دم ہیں ہزاراں | .... اصحاب کامل چار یاراں
اول افضل ہیں بو بکر صدیقؓ | دوجی عادل عمر فاروقؓ تحقیق
تجی عثمانؓ حیا ہور حلم کی کھان | ہیں چوتھے شیر یزداں شاہ مرداں

ان مثالوں کے بعد دکنی کے مذہب کے متعلق کسی گفتگو کی گنجایش باقی نہیں رہ جاتی۔

بعض شکوک دکنی دہلوی کے متعلق مجھے ایک چیز ضرور کھٹکتی ہے۔ وہ یہ کہ ان کی ایک اور تصنیف رتن و پدم کا ذکر "اُردوئے قدیم" میں ہے اس کے دس شعر بھی نمونۃً دیے گیے ہیں۔ جن میں سے نو شعر بحر ہزج، مسدس، محذوف میں ہیں لیکن ابتدا کا ایک شعر بحر متقارب مثمن مقصور میں معلوم ہوتا ہے:

خدایا تو ہے پاک پروردگار | نرنکار دا آتار دا آچھی اتار

دکنی کے یہاں اگر ترتیب میں چستی نہ ہو مصرعوں میں سکتے ہوں،

اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہوں تو وہ سب قابلِ قبول ہیں۔ لیکن بالکل بحر ہی بدل جائے یہ میرے ناقص خیال میں نہیں آتا۔ جو اشعار نقل کیے گئے ہیں ان میں دو شعر ایسے ہیں جن کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان میں ولی تخلص موجود ہے۔

ولی تیرے کرم کی ہے مجھے آس — نہ کر اس آس سوں ہر گز تو نیراس
ولی ہے پو سبب خالی بہانہ — اسی کا کام ہے دینا دلانا

میرے خیالِ ناقص میں یہاں "ولی" کے بجائے "ولے" بہتر ہوگا۔ اور کم از کم پہلے شعر میں تو "ولے" ہی مناسب اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ مفہوم قطعی غیر موزوں ہو جائے گا۔ اگر یہ مثنوی کہیں مل سکتی تو ہمارے ادیب اس کا زیادہ گہرا مطالعہ کر سکتے۔ دوسرا شک یہ ہے کہ کتاب "دکن میں اُردو" (طبع ثانی ۱۳۵ ص) میں ہے کہ محکم نے بھی سنہ ۱۲۳۱ھ میں مثنوی روضۃ الشہداء تصنیف کی اور اُس کے چند اشعار دیے ہیں۔ وہ یہ ہیں:-

چلانے جب لگے اعدا پہ تروار — ہوئی ڈھال سینکڑوں لاشوں کی انبار
چلائی تیغ وہ جب شاہ یثرب — لگے پھر کانپنے ارض و سما سب

یہی دو شعر اسی کتاب کے صفحہ ۵۱۴ پر بھی ہیں۔ جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ ایک اور شخص کی وہ مجلس سے لیے گئے ہیں۔ جو سنہ ۱۲۳۰ھ میں مرتب ہوئی تھی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کچھ اور وضاحت زیادہ مفید ثابت ہوتی

بہرحال مجھے خوشی ہو گی اگر ہمارے ادیب ان شکوک کو رفع فرمائیں گے۔

مثنوی پند نامہ | جو مخطوطہ میرے پیش نظر ہے اس کے حاشیہ پر ایک مختصر سی مثنوی "پند نامہ" بھی ہے۔ حاشیہ اتنا زیادہ کٹا پھٹا ہے کہ اس کے اشعار کا سمجھنا محال ہے۔ یہ مثنوی بھی مذہبی رنگ میں ہے۔ آخری تین شعر کچھ صاف ہیں۔

ہویاں سو اُپر پانچ بیتاں تمام — زصدقہ محمدؐ علیہ السلام
اتھا سال ہجری اُسے یک ہزار — ربیع الاول ماہ، دیں ایتوار
سو تب یو مرتب ہوا ہے کلام — تصرف کیا دیں........ تمام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "یہ "پند نامہ" اتوار کے دن ربیع الاول سنہ ۱۰۰۸ھ میں مکمل ہوا۔ اس میں ایک سو پانچ شعر ہیں۔

مثنوی اساس المصلّی | اسی مخطوطہ کے شکستہ حاشیے پر ایک اور مثنوی "اساس المصلّی" ہے جس میں تقریباً تین سو شعر ہیں، جو نماز کے ارکان وغیرہ سے متعلق ہیں۔ آخری شعر یہ ہیں:۔

اساس المصلّی ہوا سب تمام — بحقِ نبیؐ پر دروداں کہو والسلام
کیا اشتیاقی نے دکھنی اسے — سمجھ آئے گر ٹیک یو ہر کسے
سہنسر پوچ تھا اٹھا سال جب — مرتب ہوا یو رسالہ سو تب

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی شاعر اشتیاقی نے سنہ ۱۰۰۶ھ میں

مثنوی "اساس المصلی" عربی یا فارسی ماخذ سے دکنی اردو میں منتقل کی، یہ دو مثنویاں بھی اسی خط میں ہیں۔ جن میں روضۃ الشہداء، روضۃ الانوار اور روضۃ العقبیٰ لکھی ہوئی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ وہ دستخط (جیساکہ اوپر لکھا جا چکا ہے) ولی ویلوری ہی کے ہیں، تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید "پند نامہ" اور "اساس المصلی" کے مصنف ولی کے بزرگوں میں سے ہوں گے۔ یا کم از کم وہ شاعر ایسے ضرور ہوں گے جن کی وقعت ولی کے دل میں ضرور ہو گی۔ ورنہ ولی جیسا باکمال اور پُرگو شاعر ہرگز کسی کا کلام نقل کرنے میں وقت صرف نہ کرتا۔

ولی گجراتی کا کچھ غیر مطبوعہ کلام[1]

اب سے تقریباً بیس برس پہلے استاذی حضرت احسن مارہروی مرحوم نے ولی کا دیوان مختلف نسخوں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ اور محترم ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے اُسے اختلافِ قراءت کے ضمیموں کے ساتھ شایع بھی کرا دیا تھا۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ ان بزرگوں کو بھی ولی کے کلام اور حالات کے متعلق مزید تحقیقات کی بنا پر اپنے نظریے بدلنے پڑے۔ چنانچہ ولی دکنی اب ولی گجراتی (احمد آبادی) مانے جاتے ہیں۔ کیونکہ گجرات بھی دکن میں شامل تھا۔ اور مثنوی روضۃ الشہدا ان کی نہیں بلکہ ولی ویلوری[2] کی ہے

---

[1] معارف (اعظم گڈھ) اگست ۱۹۴۵ء۔

[2] حکیم شمس اللہ قادری صاحب کی "اُردوئے قدیم" صفحہ ۱۰۰ میں ابھی ولی کا نام سید محمد لکھا ہے لیکن میرے ایک شاگرد (مسیح الدین حسن صاحب کے یہاں) ایلچپور (برار) میں زبانی معلوم ہوا

کی سمجھی جاتی ہے۔ ولی گجراتی کی تاریخ وفات جو کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی کے ایک نسخہ (دیوانِ ولی۔ نوشتہ ۱۱۵۲ھ) میں شاید راقم کو سب سے پہلے نظر آئی تھی۔ اور اب بہتر اہل قلم بزرگوں کے ہاتھوں سے شرف اشاعت حاصل کر چکی ہے۔ اس طرح ہے:۔

مطلعِ دیوانِ عشق سیدِ اربابِ دل　　ولیِ ملکِ سخن صاحبِ عرفاں ولی
سالِ وفاتش خرد از پئے الہام گفت　　بادپناہِ ولی ساقیِ کوثر علی[2]
۱۱۱۹ھ　۱۱۱۸

اسی طرح مثنوی روضۃ الشہداء کے متعلق عرصہ سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے

(حاشیہ صفحہ ۳۵) روضۃ الشہدا کا جو نسخہ ہے اس کے آخر میں اس کا نام میر ولی فیاض ہے۔ عبارت یہ ہے: "کتاب روضۃ الشہدا از تصنیف میر ولی فیاض علیہ الرحمۃ در بلدہ ایلچپور بتاریخ بست و پنجم شہر جمادی الاول ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۲۱۹ فصلی بہ اتمام رسید"۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ محترمی پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی نے ولی گجراتی کے متعلق تفصیل سے لکھنا شروع کیا ہے

[2] عجیب اتفاق ہے کہ میں بعض دیگر ماخذوں کی تلاش اور انتظار ہی میں تھا کہ خوش قسمتی سے یہ قطعہ تاریخ ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور فاضل پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب شیروانی نے شایع کرا دیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں مثنوی "فیض عام" (نوشتہ ۱۲۱۱ھ) کے متعلق لکھنا چاہتا تھا کہ حافظ صاحب موصوف کے قلم سے اس کے متعلق مضمون نظر سے گذرا۔ ان اتفاقات سے مجھے دلی خوشی ہوئی کہ یہ کام خدا نے مجھ سے زیادہ بہتر لوگوں کے ذریعہ انجام کو پہنچایا۔

کہ وہ ولی ویلوری کی ہی۔ لیکن اس کی دو اہم اور نایاب مثنویاں یعنی روضۃ الحقیقا اور روضۃ الانوار جن کے متعلق معارف (جنوری ۱۹۴۰ء) میں راقم الحروف بتفصیل لکھ چکا ہے، ہنوز اہلِ نظر سے پوشیدہ ہیں۔ اور افسوس ہوتا ہے کہ بعد والی کتابوں میں بھی ولی ویلوری کی صرف پہلی مثنوی ہی یاد کی جاتی ہے۔

بہرحال یہ تو معترضہ جملے تھے۔ میں یہاں دیوان ولی گجراتی کے ایک ایسے نسخہ کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو باوجود ناقص ہونے کے اہم ہے۔ یہ نسخہ مجھے بھوپال میں پیر دروازہ کے قریب ایک بہت معمر کتب فروش کے یہاں ملا تھا، جو نواب محمد یار خاں (المتوفی سنہ ۱۱۶۷ء) کے عہد میں لکھا گیا تھا۔ اس کے شروع اور آخر کے کچھ اوراق نہیں ہیں۔ اس میں خصوصاً وہ قطعہ نہیں ہے جو روضۃ الشہدا کے متعلق ہے۔ لیکن غلطی سے انجمن ترقی اردو کے نسخہ (ص ۳۸۶) میں شایع ہو گیا ہے۔ اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہیں، اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کی قرأت (بہ نسبت مطبوعہ نسخے کی قرأت کے) زیادہ قرین قیاس ہے۔ اور اُن اختلافاتِ قرأت سے بھی مختلف ہے جو بطور ضمیمہ، مطبوعہ نسخہ میں شامل ہیں۔ مثلاً مطبوعہ نسخہ کے ص ۴۹ پر ایک غزل "خدا سوں ڈر" ردیف کی ہے۔ اس کے حسبِ ذیل اشعار کسی نسخہ میں نہیں ہیں۔ صرف اسی نسخہ میں ملتے ہیں۔

اب جدائی نہ کر خدا سوں ڈر   جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر

دل ربائی میں ہے تو شہرۂ شہر　　دل ہوائی نہ کر خدا سوں ڈر

عاشقاں سوں ہو رنگ اک دلبر　　اور جائی نہ کر خدا سوں ڈر

پاک بازاں سوں صدق کر پیشہ　　رو ریائی نہ کر خدا سوں ڈر

حاضر الوقت عاشقاں سیتی　　ماجرائی نہ کر خدا سوں ڈر

اب ہم اس نسخہ کے اختلافِ قرأت کو پیش کرتے ہیں جس میں کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی ملے گا۔ صفحات اور اشعار (جن کا شمار شروع غزل سے ہے) کا حوالہ انجمن ترقی اردو کے مطبوعہ نسخہ سے دیا جاتا ہے۔ اور ان صفحات کی تقدیم و تاخیر سے ہمارے نسخہ کی ترتیب بھی کسی حد تک سمجھ میں آسکے گی۔

ص ۱ شعر ۵ کرے تا تجھ شکر لب سوں طلب یک بوسۂ شیریں
مرے دل نے لیا ہے اس سبب شیوہ گدائی کا

ص ۲۱، ۳ ع تجھ مکھ کے آب حسن کا گھیتھے تھے جب حساب

ص ۱۹، ۳ ـ تجھ نین کی دیکھن کا دل ٹھاٹھ کر چلا تھا
غمزے کے دیکھ ٹھٹ کوں لاچار ہو گے ٹھٹ کا
(یہ کسی حد تک ضمیمہ کے مطابق ہے)

ص ۷، ۱ ع چاند کوں ہے آسماں پر عکس تجھ رخسار کا

ص ۷، ۲ جب سوں تیری زلف کوں دیکھا ہے زاہد اے صنم
ترک کر تسبیح، ہے مشتاق تجھ زنار کا

ص ۸، ۲ بلبل دپروانہ گریلا دل کے تئیں   کام ہے تجھ چہرۂ گلنار کا

ص ۱۰، ۴ ع شرمندہ ہوں تجھ مکھ کے دیکھے نور سکندر۔

ص ۱۲، ۴ ع یہاں بیم کے بھنور میں گرداں ہے کشتی عقل۔

ص ۱۳، ۵ ع ہوا ہے رام بن حسرت دوجا لکھمن سو رام اُس کا

ص ۱۸، ۸ ع تجھ نگہ سوں یہ شکل کمان عسل۔

ص ۱۸، ۱۰ ہر طرف جگ میں ہے روشن نام شمس الدین کا

کیا عجب گر تجھ سے لیویں درس سب تمکین کا

ص ۵۰، ۵ ع سب سے ممتاز ہوا سلسلۂ معنی میں۔

ص ۵۰، ۲ بند کرنے دل وحشت زدہ کوں   دام رہ زلف گرہ گیر کیا

ص ۵۱، ۶ شمع مانند جلی اوس کی زباں   جن نے مجھ سوز کوں تقریر کیا

ص ۵۲ غزل نمبر ۳ کا مطلع ثانی اس نسخہ میں بھی نہیں ہے۔ استاذی حضرت

احسن مارہروی مرحوم کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ الحاقی ہے۔

ص ۵۳، ۲ ع یو مکھ ترا ہے جوں کعبہ، بھواں ہے جوں محراب (ساتواں شعر

اس نسخہ میں بھی ہے)

ص ۵۵، ۱ ع جو کنٹھا برہ کی پہنے اُسے گھر بار کرنا کیا۔

ص ۵۵، ۳ ع سکھی تمنا کوں ارزانی یو کسوت ہور زینت سب

ص ۵۵، ۴ خجالت کی گرد انجھواں کے پانی سوں ملا کر   بنائے غم کے گھر مجھ کو دوجا معمار کرنا کیا

صـــ ۵۶، ۶ ع محل دل کا تیری خاطر بنایا ہے میں الفت سوں.

صـــ ۵۲، ۲ دیکھا ہے تیری زلف کے حلقے منی کوں یک نظر

تجھ خال کے نقطے منی وہ بے سرد بالا ہوا

صـــ ۵۲، ۳ جس وقت سوں تجھ قد کے تئیں لایا ہے شاعر دُرِ فکر

اُس وقت سوں البتہ کہ نرخِ سخن بالا ہوا

صـــ ۴۳، ۹ یہ شعر اس نسخے میں بھی نہیں ہے۔ استاذی حضرت احسن کا خیال صحیح ہے

کہ وہ حاتم کا شعر ہے.

صـــ ۴۴، ۷ ع شہرہ ہوا ہے جب سے ترے شعر کا دکی.

صـــ ۴۵، ۳ نور کا ہے گنج یو تیرا جمال حُسن کے گوہر کا دل معدن ہوا

صـــ ۴۷، ۱ ع سر اُپر اُس کے بگولا چتر سلطانی ہوا.

صـــ ۲۹، ۱ یو آج جو سینہ شاد دستا مطلب ہے جو بامراد دستا

صـــ ۲۹، ۵ مرنے دل کا جو گوہر غرقِ بحرِ حُسن ہے نایاب

صـــ ۳۵، ۴ نہ پوچھ دل میں دو جی کا لیاں برابر تجھ

شکر گھُلی ہے جُدا ہور گھلا ہے قند جُدا

صـــ ۶۰، ۷ ع نکلا اسیر جامۂ خاکستر آفتاب

صـــ ۸۰، ۱۴ جاناں کو بس کہ خوفِ رقیباں ہے دمبدم

ہوتا ہے جان بوجھ کے ہم سوں اجان آج

صہ ۸۲، ۷ ع کہ مے پرست کے سینے میں ہے دعاے قدح،

صہ ۸۳، ۲ ع آپس کی دونوں زلف کون نہ کرتا گستاخ،

صہ ۸۸، ۹ ع کیا ہے طرزِ تغافل نے شوخ کے جگ میں،

صہ ۹۳، ۲ ع ترے گلزارِ رنگیں کا جو کوئی مقتول ہے اے گل،

صہ ۹۵، ۱ ع سنایا جیوں خبر شادی کی قاصد صبح دم آکر،

صہ ۹۶، ۳ ع گرفتاراں کی غم خواری اِتا لازم ہوئی تجکوں،

صہ ۱۰۴، ۳ ع آدے گر انکھیاں میں وہ نور بصر،

صہ ۹۹، ۷ ع مجھ عاشق بے کل سوں نہ توں وعدہ کل کر،

صہ ۹۶، ۱ ع عاشقاں کے اُپر ستم مت کر،

صہ ۱۰۲، ۵ ع جو کوئی باندھا ہے تیری زلف سوں دل،

صہ ۹۴ یہاں وہ زائد اشعار ہیں جو شروع میں نقل ہو چکے ہیں۔

صہ ۱۱۶، ۶ ع بن اُس کے جا کیا ہے یو تجھ کوں خمار محض

صہ ۱۲۱، ۱ ع اس شوخ شعلہ خیز سوں حیراں ہے جیوں چراغ۔

صہ ۱۲۸، ۷ ع خوشبو بدن پہ تیری زلفاں کہیں ہیں موہن۔

صہ ۱۲۹، ۷ ع نہ پایا ہے البتہ تیرا مثال

صہ ۱۳۰، ۴ ع پہنچا ہے جا کے رُخ کوں صنم کے نزدیک جب۔

صہ ۱۳۲، ۴ ع نہیں کچھ زر و مال کی دل میں طمع۔

ص ۱۳۵، ۶ ع نام تیرا ہوا ہے انبرت لعل۔

ص ۱۴۵، ۲ ع تا یک نگہ میں آدے تجھ پاس مثل شبنم۔

ص ۱۴۱، ۵ ع لطف سوں گر یک نگہ تجھ کوں مودّت کی قسم۔

ص ۱۴۵، ۳ ع تجھ سنبل پر پیچ کی خوبی میں نظر کر۔

ص ۱۵۲، ۳ ع قران کب ہو میسر ترا اے زہرہ جبیں۔

ص ۱۵۳، ۷ ع ولی کے دل کی حقیقت بیاں سو کیوں کہ کروں۔

ص ۱۵۹، ۴ ع تجھ باحیا کی پگ پر آ کر سورج حیا سوں۔

ص ۱۶۰، ۱ ع رکھتا ہے پنہاں برمنیں جوں شمع وہ زنار کیوں۔

ص ۱۷۰، ۴ ع تجھ پانو آگے فرش کروں آج پیری کوں۔

ص ۱۷۹، ۱ ع طاقت جواب کی نہ رہے آفتاب میں۔

ص ۱۸۵، ۲ ع نشۂ ہوش ہے اس بادۂ حیرانی میں۔

ص ۱۸۹، ۱ ع اگر گلشن میں وہ رنگیں قبا نئیں۔

ص ۱۹۰، ۵ ع یو مری جان کے نامے ستی آگاہ قاصد نئیں۔

ص ۱۹۲ غزل نمبر ۲۵۹ کا یہ شعر کسی اور نسخے میں نہیں ہے۔

بوالہوس سوں غرض نہیں دھرتے

عاشقاں پر یو دند کرتے ہیں

ص ۱۹۳، ۱ ع نقد ہستی نثار ڈالے ہیں۔

ص۱۹۱، ا ع ، فکرِ ناموس و ننگ و نام نیں ۔

ص۱۶۳، ا ع آتی ہے فوج حسن تری جلوہ گاہ میں ۔

ص۲۰۹، س۲ ع ہر یک سوں ترا جگ میں آوازہ ہوا تازہ ۔

ص۲۰۵ یہ شعر بھی کسی اور نسخے میں نہیں ہے صرف ہمارے نسخے میں ہے ۔

شتابی جیوں کر دل تسلیم باندازہ اُس رہ کا

دھرے گر مجھ طرف موہن چرن آہستہ آہستہ

ص۲۱۰، ۵ ع مت کہہ ادیس کا حال پریشاں رماں اگے ۔

ص۲۴۷، س۳ ع کہا مژگاں نے اُس کی شوخیاں کوں

ص۲۵۲، ۸ ع مہر ہے ، لطف ہے ، مدارا ہے ۔

ص۲۷۶، ۶ ع دل نہ دے دبجے کو غافل دیکھ اسے ۔

ص۲۵۴، س۴ ع پیا ہے جام دل سوں بادۂ خوں ۔

ص۲۵۷، ۲ ع جیوں ادا محبوب سوں محبوب ہے ۔

ص۲۶۰، ۶ ع حرف شیریں ہر گھڑی ہوتے ہیں اس سوں جلوہ گر ۔

ص۳۴۴، ۷ ع دستگیری تری ہو ظاہر تب :

ادبِ قدیم سے شغف رکھنے والے اصحاب جب مطبوعہ نسخے کی مختلف قراءتوں کا اس نسخہ سے تطابق فرمائیں گے تو اُنھیں معلوم ہوگا کہ اس کی قرأت کس قدر اس کے مقابلہ میں بہتر ہے ۔ ولیؔ کے اس طرح کے ادب کتنے

اشعار ہوں گے جو ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ اگر انجمن ترقیِ اُردو چاہے تو کلیاتِ ولی کے دوسرے[1] اڈیشن میں بطور ضمیمہ اس مضمون کے ضروری اجزا کو شامل کر سکتی ہے۔ اور مزید تطابق کے لئے یہ نسخہ حبیب گنج سے منگوایا جا سکتا ہے جہاں وہ اب محفوظ ہے۔

---

[1] دوسرے اڈیشن میں اس سے مدد لی گئی ہے جیسا کہ اس کے مقدمے میں ذکر ہے۔

خاکیؔ

حالات اردو کے صوفی شاعر خاکیؔ کے متعلق آج یہ معلومات نذرِ ناظرین ہیں ان کا مکمل دیوان حبیب گنج میں ہے جس کے اوراق کی تعداد اکیانوے ہے۔ اور اشعار تقریباً اٹھارہ سو ہیں۔ خط نسخ ہے، اور خاتمہ کی عبارت یہ ہے:۔

"تمت تمام شد دیوانِ رنگین من کلامِ توحید انجام سید محمد قادری عرف مدن[2] صاحب ابن سید جمال اللہ قادری مدظلہم العالی"!

"بخط نوشت سید حسین قادری عرف شاہ میاں، بتاریخ دہم ربیع الاول ۱۱۵۲ھ قلم شد"۔

اس عبارت سے یہ چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

۱۔ خاکی کا نام سید محمد تھا، اور عرف "مدن صاحب"

---

[1] معارف (اعظم گڈھ) مارچ سنہ ۱۹۴۲ء [2] تمکین صاحب نے (تذکرہ ریختی ص ۳۶) اس جگہ "مدن صاحب" کی بجائے "بڑے صاحب" پڑھا ہے۔

۲۔ ان کے والد کا نام سید جمال اللہ تھا۔ اور یہی غالباً اُن کے پیر بھی تھے۔ جیسا کہ ان کے بعض اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

جمال اللہ مرشد جب دیکھا کر پیو کوں خاکی   کیا ہی تجکوں او محرم بھی نامحرم سوں کیا مطلب

خاکی جمال ذات اپس پیر کوں سمجھ   تجکوں کیا ہی مست جو اُن پیو سوں ملا

اپنے خاکی کتیں جمال اللہ   نت پیا سوں ایسے ملا دینا

۳۔ لفظ "قادری" جو خاکی اور اُن کے والد کے نام کے ساتھ پایا جاتا ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ پیری مریدی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۶۱ھ ۱۱۶۶ء) کے سلسلے میں منسلک تھے، اسی لئے خاکی نے کئی قصیدے شیخ کی مدح میں بہت عقیدت کے ساتھ لکھے ہیں۔

ایک کا مطلع یہ ہے:۔

توں بادشاہ دو جہاں یا غوث الاعظم دستگیر   ہے لامکاں تیرا مکاں یا غوث الاعظم دستگیر

ایک اور جگہہ کہتے ہیں:۔

یوں تصدق ہے غوث الاعظم کا   فیض اُن کا ہر آن ہے ہو حق

۴۔ کاتب "سید حسین قادری" عرف شاہ میاں بھی غالباً خاکی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس نے اِس دیوان کی تکمیل ۱۰ ربیع الاول ۱۱۸۲ھ مطابق دو شنبہ ۲۵ رجولائی ۱۷۶۸ء میں کی تھی۔

۵۔ فقرۂ "مدظلہم العالی" خاکی کے نام کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے

جس سے صاف ظاہر ہے کہ خاکی کم از کم ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء تک ضرور زندہ تھے جب کہ یہ دیوان مکمل ہوا۔

یہ چند باتیں تو خاکی کے متعلق بلاشک و شبہ صحیح ہیں۔ اب دوسرے مشتبہ حالات کو پرکھنا ہے۔

میر حسن دہلوی کا تذکرہ جو ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء اور ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء کے درمیان لکھا گیا ہے[1]، اس میں ایک خاکی کا حال پایا جاتا ہے، جو یہ ہے:-

"خاکی تخلص مردے بود درویش از شاہجہاں آباد در عہد جہانگیر، احوالش معلوم نیست۔ از یک مرد پیرے ایں شعرش بگوش خورد، از دست"

ٹھانی ہے اپنے من میں اب تو یہی لے سجن — تجھ بیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا"[2]

صاحب گل رعنا (ص ۱۱-۱۲) کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ اس عبارت میں جہانگیر کے بجائے عالمگیر (المتوفی ۱۷۰۷ء) ہونا چاہیئے۔ اور یہ خاکی وہی ہیں، جن کا دیوان حبیب گنج میں ہے۔ میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ ہمارے خاکی بالکل مختلف شخص ہیں۔ اور ان کا تعلق شاہجہاں آباد (دہلی) سے نہیں بلکہ دکن سے تھا۔ ثبوت حسب ذیل ہیں:-

۱- میر حسن دہلوی نے جس خاکی کا شعر نقل کیا ہے وہ ہمارے خاکی کے دیوان میں نہیں ہے۔

---

[1] تذکرہ مطبوعہ علی گڈھ سنہ ۱۹۲۲ء ص ۳ — [2] تذکرہ مطبوعہ علی گڈھ ص ۲.

۲۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے خاکی کم از کم ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء تک یعنی عالمگیر اورنگ زیبؒ کے بھی تقریباً ساٹھ سال بعد تک زندہ تھے۔ اور یہ زمانہ قریب قریب وہی تھا، جب کہ میر حسن دہلوی نے اپنا تذکرہ لکھا ہے۔ اب اگر ہمارے خاکی دہلی کے ہوتے تو میر حسن اپنے ہم وطن اور ہم عصر شاعر کے متعلق صرف اتنا لکھنے پر اکتفا نہ کرتے کہ "احوالش معلوم نیست"۔

۳۔ جب وقت ہمارے خاکی زندہ تھے، اُس وقت تک شاہجہاں آباد (دہلی) کی زبان بہت صاف ہو چکی تھی۔ اور اُردو کے چند بہترین شعراء مثلاً میر، سودا، درد وغیرہ مشہور ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کی زبان ہرگز وہ نہ تھی جو ہمارے خاکی کی ہے، جن کے یہاں دکھنی زبان و بیان کے علاوہ خیالات بھی دکنی کی طرح دکھنی اثر سے متاثر ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خاکی شاہجہاں آباد (دہلی) کے نہ تھے۔

۴۔ ایک اور بات غور طلب ہے۔ اور میرے خیال میں وہ خاکی کو دکھنی ثابت کرنے میں مدد دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ اُن کا پورا دیوان پڑھ جایئے۔ بعض بزرگوں کی مدح میں قصیدے نہ پائیے گا۔ لیکن ہندوستان کے صرف ایک بزرگ دکن والے یعنی حضرت گیسو دراز "بندہ نواز" (گلبرگہ)، (المتوفی ۸۲۵ھ / ۱۴۲۲ء) کی مدح میں صرف ایک قصیدہ ہے، مطلع اس کا یہ ہے:

نزولِ رحمتِ ربِّ کریم بندہ نواز
توں فیض بخش ہے گنجِ رحیم بندہ نواز۔

ان باتوں سے یقین کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے خاکی دکنی تھے۔ اور وہ برہان پور کے ہوں گے جو دکن میں شمار ہوتا تھا۔ اور ادب کا مرکز تھا۔ وہاں ایک محلہ اور قبرستان جمال پورہ کے نام سے اب بھی موجود ہے اور مشہور ہے کہ خاکی کے والد سید جمال اللہ قادری ہی سے وہ متعلق ہے۔

خاکی کی سخن گستری حبیب گنج والے نسخہ میں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے اکیانوے اوراق ہیں۔ ہر صفحہ پر عموماً دس شعر ہیں۔ اقسام نظم یہ ہیں:-

(۱) غزلیں جو سب کی سب عشق حقیقی کے نغموں سے پُر ہیں۔

(۲) قصیدے، کئی قصیدے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں ہیں۔ ایک قصیدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

صاحب شجاع و ممبلی بیشک ولی اللہ علیؓ　　　نیں ہے جدا حق سوں کبھی بیشک ولی اللہ علیؓ

ایک اور قصیدہ حضرت گیسو دراز "بندہ نواز" کے متعلق ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

(۳) کئی مستزاد ہیں۔

(۴) ایک مثنوی بھی ہے جس میں پچپن ۵۵ اشعار ہیں۔ ارکان اسلام کی تاویل صوفیانہ رنگ میں کی گئی ہے۔ شروع کے اشعار یہ ہیں:-

کہوں کیا زباں سوں خدا کی صفت　　　صفت ہو کہ موجود ہے سب جگت

خدا کوں صفت سب سزاوار ہے ۔ وہی جزو کل کا سپدا یار ہے
جنے حق کو پایا جہاں میں نہیں ۔ رہے ہو کے امّی حشر تک وہیں
سمجھ کر اپس کے اول جیو کوں ۔ اپس جیو میں دیکھ لے پیو کوں
ذرا نقص تو باطن کے ہیں پانچ جان ۔ بیاں کھول کرتا ہوں اس کوں پچھان
محمدؐ کے جب نور میں رب کا نور ۔ دسے پہ سمج او ہی کلمہ ظہور
مثال اس کی کہتا ہوں کر گیان توں ۔ اسے سن اتا دل کے توں کان سوں
کہ جوں ماہ کے نور میں تج دسے ۔ کہ خورشید کا نور اس میں بسے
جو نورِ علی نورِ حق نے کہا ۔ سمج اس کتیں بے خبر کیوں رہا
محمدؐ کے نت نور میں ذات کوں ۔ کہ پاتا ہے او صلوٰۃ لبطوں
وصل پا کے واصل چھپی بات کوں ۔ سنے ہور کہے بلکہ او ذات سوں
وصل پا خدا سوں جو پاتاں سنے ۔ صلوٰۃ لبطوں سوں ادا ہو اوسے
سمج لے خدا کا سبھی ہے قول یوں ۔ سخن رب سوں کرنا نماز لبطوں

دیوان میں خاکی کی سخن گستری بس انہی اقسام تک محدود ہے لیکن گلِ رعنا (صفحہ ۱۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک مثنوی "فیضِ عام" بھی لکھی تھی، جو مولوی عبدالرزاق صاحب مرحوم (چیف ٹرانسلیٹر، ناگپور) کے کتب خانہ میں تھی۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے جب کہ میں علی گڈھ میں تھا مجھے یہ اشتیاق پیدا ہوا تھا کہ چونکہ میرے وطن جبل پور سے ناگپور قریب ہے

اس لیے میں آسانی کے ساتھ اس مثنوی کا پتہ چلا سکوں گا۔ مولوی صاحب مرحوم[۱] کی زیارت مجھے نصیب ضرور ہوئی۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اُنھیں اس سلسلہ میں نہ پہچان سکا تھا۔ اب اُن کے بھائی عبدالستار صاحب سے شہر ایلچپور (برار) میں وہ مثنوی دیکھنے کو ملی۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ پھر کبھی پیش کروں گا۔ ابھی مختصراً اتنا عرض کرتا ہوں کہ وہ مثنوی خاکی کی نہیں ہے۔ بلکہ ایک دوسرے شاعر عبدالمحمد کی ہے۔ مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد صاحب "مہدی" جونپوری (المتوفی ۹۱۰ھ ۱۵۰۵ء) کے کوئی "صحابی" شیخ ولیش (؟) تھے، ان کے پوتے مصطفےٰ تھے، جنھوں نے مہدوی عقائد کی بہت تبلیغ کی تھی۔ اسی کی تفصیل اور مصطفےٰ کے حالات زندگی پر یہ مثنوی مشتمل ہے۔ تقریباً چار ہزار اشعار ہیں۔ اور اس طرح حمد سے شروع ہوتی ہے:۔

خدا کی کروں صفت اول بیاں　　　بنایا جنے سب زمیں آسماں
بھی انسان کوں خاک سیتی کیا　　　انا سرہٗ شرف اس کوں دیا
جنے جان کوں آگ سو کر بدن　　　پری جن کا تسیں بچھا رتن

یہ قصہ دراصل کسی شیخ آدم نے فارسی میں لکھا تھا جس کا یہ دکنی منظوم ترجمہ عبدالمحمد نے کیا ہے۔ شاعر خود کہتا ہے:۔

---

[۱] مولوی صاحب مرحوم کے صاحبزادہ حمیدالرزاق صاحب بھی اپنے والد صاحب کے عہدہ پر فائز ہیں۔ ان کے یہاں مہدوی مذہب کے متعلق کافی کتابیں ہیں۔ سید محمد صاحب "مہدی" کا ایک اُردو فقرہ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے۔ "ہموں تموں میانے خدا بہتر کے میرے جیو"۔

اتا سن بیاں اس قصے کا اے یار — اگر تو اچھے دل منے ہوشیار
میاں مصطفےٰ کا قصہ فارسی — بنایا تھا دل کھول جیوں آرسی
میاں شیخ آدم نے کر کر بیاں — سو بولے تھے اس کوں مبارک زباں
ولے ان پڑھیا اس کوں کیا بوجھتا — کہ جیسے اندھے کو نہیں سوجھتا
سہل کر کو دکھنی میں جوڑی کتاب — سمجھنے میں ہر اک کے آوے شتاب
کیا ہے یو دکھنی زباں سوں کلام — رکھا ناؤ اس کا یقیں فیض عام

اب ہم اس مثنوی کے آخری اشعار نقل کرتے ہیں جس سے شاعر کا نام اور تاریخِ تالیف معلوم ہو سکے گی۔

نویں چاند شعبان کی رات کوں — خدا نے یو آخر کیا بات کوں
اتھا سن ہجری جداں یک ہزار — بھی یک سو پچاس یک در شمار
سو عبد المحمد نبیؐ کا غلام — خدا کے فضل سے کیا یو تمام
اتا چاہتا ہے یہ عاجز غریب — کہ ہو عاقبت بیچ نیکی نصیب
کہ یعنی خدا آپ کر کر فضل — سو ایمان بخشے عطا بے خلل
شریعت نبیؐ کی اوپر مستقیم — ٦٠ — رکھے آپ صاحب غفور الرحیم

پڑھے جو میاں مصطفےٰ کا ذکر — بھی جو کر عقیدہ سنے کان دھر
تو اپنی زبان سوں خدا کے بدل — دعا سوں کرے یاد صاحب عقل
دگر جو خطا چوک دیکھیں کبھی — تو کر عیب پوشی سنواریں سبھی

نبیؐ پر درود اں پڑھو بے شمار　　بھی مہدیؑ پہ بھیجو سلاماں ہزار

اِن اشعار میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ عبدالحمد نے (شب پنجشنبہ)

۹ر شعبان ۱۲۱۱ھ (مطابق ۲۷ر فروری ۱۷۹۶ء) کو یہ مثنوی مکمل کی، یعنی

یہ شخص ہمارے خاکی سے کم از کم چالیس سال پہلے ہوا ہے اور وہ مہدوی

بھی تھا۔ اسی لیے خاکی کے برعکس اس نے حمد و نعت کے بعد سید محمد

"مہدی" جونپوری اور اُن کے بعض خاص "صحابہ" کی منقبت بھی لکھی ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب ایک سوال اور رہ جاتا ہے کہ خاکی نے کیا

ریختی بھی لکھی تھی۔

جناب تمکین صاحب نے تذکرہ ریختی ص ۳۶ میں خاکی کے اِن

اشعار کو ریختی کہا ہے :-

پیا بن اے سہیلی الجھوں سے مکھ دھوتی ہوں　　کبھی میں متقنع گھر اندھیرا دیکھ روتی ہوں

کرو پیو پیر سیں ظاہر تو سب مل ساہو سکیاں　　جم نیب بحر میں غم کے تر بن نت تو کھوتی ہوں

تو جاری عین مکن ہو ملے جب دیکھ بالا سوں　　بھٹی سوں برہ کی تپ میں نکل ہو ست سا سوتی ہوں

رہوں میں کب تلک جھرتی جلا کر دل کتیں کرتی　　کہ اب غم کے پہاڑ دن بھلا ای سر بڑدتی ہوں

رہوں کیوں ابتدا میں میں دے جب انتہا مجکوں　　فنا فی الشیخ ہو کر میں بقا باللہ ہوتی ہوں

سجن کا دید کرنے کہ محبت کے پو رشتہ میں　　سدا میں من کے منکوں کوں الپس ملکھو پروتی ہوں

درختِ عاشقی کوں میں فقر کے پھول پھل ہونے　　نت اُٹھ کر دل میں میں اپنے او تخم عشق بوتی ہوں

کروں ممکن کہ ساقی میں کبھی بیر لدنی کا ملول جب باٹلے کے پیو پو دامن دھوتی ہوں
مدد سوں شاہزادہ کی ترقی پاکے اے خاکی کبھی وحدت کے دریا میں مرا یے پن ڈبوتی ہوں

خاکی کی اس قسم کی شاعری کو بعض ادیبوں نے ریختی سمجھ لیا ہے، بلکہ ہاشمی بیجاپوری (م ۱۰۹۸ھ) کو بھی اسی خیال کے تحت ریختی کا پہلا شاعر قرار دیا ہے[1] لیکن مولینا عبدالسلام ندوی[2]، پروفیسر مسعود حسن رضوی[3]، جناب مبین نقوی[4] وغیرہ کے خیال کے مطابق ایسی شاعری کا شمار بھاشا میں ہوگا، جس میں عورت کا خطاب مرد سے ہے۔ میری رائے بھی یہی ہے۔ کیونکہ ریختی میں عورتوں کے جذبات، خیالات اور احساسات کے علاوہ اُن کی زبان اور اصطلاحات کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے اور ساتھ ہی "عریانی" کی جھلک بھی آجاتی ہے۔ یہ بالکل حقیقت ہے جو تمام ریختی گو شعرائے کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اور جس کا انکار مشکل ہے۔ ریختی کی یہ تعریف ذہن میں رکھتے ہوئے خاکی کے مذکورۂ بالا اشعار دیکھے جائیں تو صاف روشن ہو جائے گا کہ ان کا تعلق ریختی سے نہیں بلکہ بھاشا سے ہے جس کا اثر اُس زمانہ میں دکن میں ضرور تھا۔

خاکی کا تصوف اِس عنوان کا یہ مقصد نہیں ہے کہ خاکی کے خیالات تصوف میں کوئی خاص درجہ رکھتے ہیں۔ بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ وہ کس صوفی شاعر کے

---

[1] اردو شہ پارے (جلد اول صفحہ ۲۵۹) تذکرۂ ریختی (صفحہ مقدمہ) وغیرہ [2] شعر الہند (جلد دوم صفحہ ۸۳) [3] مجالس رنگین (مقدمہ صفحہ ۸) [4] تاریخ ریختی (مقدمہ صفحہ ۳)

پیرو ہیں ان کے اٹھارہ سو اشعار پڑھ جائیے کہیں عشق مجازی کی جھلک بھی نہ ملے گی۔ اُنھوں نے جو کچھ کہا شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ صوفی بن کر کہا۔ پھر بھی ایسا کہا کہ وہ' اُردو کے صوفی شعرا میں ممتاز سمجھے جائینگے۔

ہمارے صوفی شاعر عموماً "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" پر کاربند رہتے ہیں۔ اور اس گروہ میں جامیؒ (م ۱۴۹۲ء) بہت ممتاز ہیں۔ چنانچہ اپنی مثنوی "یوسف زلیخا" میں صاف کہتے ہیں:-

ولے فارغ ز دردِ عشق دل نیست — تنے بے دردِ دل جز آب و گل نیست[1]
متاب از عشق رو گرچہ مجازی است — کہ این بحر حقیقت کارسازی است
بلوح اول الف تا نہ خوانی — ز قرآں درس خواندن کے توانی

دوسرا گروہ حقیقت ہی حقیقت دیکھنا چاہتا ہے اور مجاز سے نفرت رکھتا ہے۔ مثلاً مولانا رومؒ (م ۱۲۷۳ء) فرماتے ہیں۔

عشقہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود
عشق نبود آں کہ در مردم بود — ایں فساد از خوردنِ گندم بود

---

[1] علامہ اقبال نے تن اور دل کے لئے خوب پیغام پیش کیا ہے:-

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلے درد آشنائے — چو جوئے در کنارِ کوہسارے

(پیام مشرق ص۱)

عشق با مردہ نہ باشد پائدار   عشق را بر حی و بر قیوم دار
رومؒ

اس دوسرے گروہ میں ہمارے خاکی بھی شامل ہیں جو مولانا روم
کی طرح مجاز کے متعلق بقولِ جگر یہ سمجھتے ہیں کہ ؏

لطف کچھ دامن بچا کر ہی گذر جانے میں ہے

اسی لیے خاکی تو یہاں تک کہتے ہیں :-

جو کرتے ہیں عالم سوں شادی نہیں   کہ احمق ہیں کرتے ہیں شادی نہیں
جسے اس حقیقت کا لذّت لگے   مجازی طرف دل کبھی نہ جھکے
مجازی حقیقت سوں کرنیں جدا   نظر سو حقیقت پہ رکھ توں سدا
خودی چھوڑ کر پا خودی کوں سدا   خودی بن نہ ہووے گا حاصل خدا
(مثنوی)

چنانچہ مولانا رومؒ اگر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ :-

گرچہ آں وصلت بقا اندر بقاست   لیک در اوّل بقا اندر فناست
آئینہ ہستی چہ باشد نیستی   نیستی بگزیں گر ابلہ نیستی

تو خاکی بھی کہتے ہیں :-

نیں فنا کوئی شے ہے عین بقا ۱۰   نفی کہتے سو ہے وہی اثبات
یوں سمجھ عارفانِ جز کل میں   ہو رہیں ہے سدا وہی ایک ذات
(مثنوی)

اسی لئے اس دنیا کو "مزرع الآخرۃ" سمجھتے ہوئے ارکانِ اسلام
کو صوفیانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں :-

سمجھ لے خدا کا بھی ہے قول یوں
سخن رب سوں کرنا نماز لطیوں

طلب جس کوں ہے حق کے دیدار کا
وہ ہے روزۂ باطنی یار کا

ہے افطار دیدار دیکھا ہے جن
نہیں کس کوں ملیا افطار دیدار بن

گواہی ہے اس پر حدیث نبی
اسی کا کہا ہوں بیاں میں لبسی

جو چوتھا فرض ہے زکوٰۃ لطوں
بیاں اس کا کرتا ہوں سن تو دل

محمدؐ کے جن نور ہور ذات کوں
اگر پاک کے ظاہر کرے خلق سوں

سمجھ لے یو باطن کا ہے گا زکوٰۃ
کیا ذکر تحقیق کر میں یو بات

فرض پانچواں یار اد بوجھ حج
بیاں کھول کرتا ہوں اس کوں سمجھ

ایس دل کوں ملیا، دل کا کرنا طواف
وہی حج اکبر ہے نیں ہے خلاف

کہ او دل جسے نیں ہے یو دل نہیں
نہ سمجھے توں یو مضغۂ گوشت کیں

کہیں ہیں نبیؐ قلب مومن دوام
کہ بیشک ہے او کعبۃ اللہ مدام

شریعت کے لوگاں کوں دعوت کروں
کندوری کوں وحدت کے آگے دھروں

اناں میں طریقت کی شادی گناؤں
حقیقت کے دولا دلہن کوں ملاؤں

او شاہد ا ہیں گنج مخفی میں جب
بجھونے کوں کر لائے دولی کوں تب

کہ دولا بھی عارد س یک جا ملے
لگے وصل میں محو ہو جا گلے

مشاطہ کوں دو لے نے اس وقت کھو
ملا جا کہ عاروس سوں ایک ہو (مثنوی)

خاکی نے جگہ جگہ رومیؒ کا اتباع کیا ہے، رومیؒ اپنے پیر کے

متعلق کہتے ہیں :۔

شمس در خارج اگرچہ ہست فرد
مثل او ہم می تواں تصویر کرد

لیک آں شمسے کہ شد ستش اثیر
نبودش در ذہن و در خارج نظیر

در تصور ذات او را گنج کو
تا در آید در تصور مثل او

شمس تبریزی کہ نور مطلق ہست
آفتاب ہست وز انوار حق ہست

ایک جگہہ اور فرماتے ہیں :۔

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست
دست او جز قبضۂ اللہ نیست

اسی طرح خاکی پوری عقیدت کے ساتھ اپنے پیر کا درجہ بیان کرتے ہیں :۔

مرشد جمال اللہ ہے خاکی وہی اللہ ہے
کُلُّ شَیءٍ لِوَجہِ اللہ ہے جا دیکھ در قرآں مجید

عین اللہ جمال لے خاکی
جس سوں پایا نشاں اے ہو حق

عین اللہ ہے جمال اللہ
خاکی اُس کے قدم پہ جا جا بک

جمال اللہ کو کل میں دیکھ رہنا
کفایت ہے کفایت ہی کفایت

لیکن جس طرح ممدوحؒ اپنے لیے بلکہ پیر کے لئے بھی شریعت مقدم سمجھتے ہیں :۔

رہبر راہ طریقت آن بود
کو بہ احکام شریعت می رود

گر نباشد در عمل ثابت قدم
چوں رہاند خلق را از دست غم

اسی طرح خاکی نے بھی صوفی کے لیے شریعت کو پہلی منزل قرار دیا ہے:-

پیو کا توں مقام پاوے تب — جب کرے توں عروج نُہ درجات
اولاً پاک ہو شریعت سوں — نفس کے دُور کر توں سب خطرات
تب طریقت میں رکھ قدم اپنا — لے حقیقت کا دیکھ کر لذّات
خاکی دریا کوں معرفت کے پَیر — بوج عرفان میں تو بیشک ذات

خاکی کے تصوف کے علاوہ زبان پر بحث کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ان کی زبان وہی ہے جو ولی کے عہد کی ہے۔ اور ناظرین خود بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رح

کے اُردو فالنامے

میرے نانا مولانا عبدالقادر خاں مرحوم ابن حضرت مولانا عبدالوہاب خاں ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانہ میں ایک قلمی بیاض ہے[1] اس میں جگہ جگہ سید عبداللہ خاں اور سید عطاء اللہ خاں حسینی شاہجہاں آبادی کے دستخط موجود ہیں اور دستخطوں کے ساتھ تاریخیں بھی درج ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رجب سنہ ۱۲۲۱ھ سے لے کر ذلیقعدہ سنہ ۱۲۳۰ھ تک ضرور یہ بیاض ان کے پاس رہی۔ اس میں رمل کے حسابات اور اور مختلف جوابات ان سوالات کے ہیں جو اُن سے دریافت کیے گئے تھے۔ کہیں کہیں دواؤں کے کچھ نسخے بھی درج ہیں، جو میر محمد تقی رضوی لکھنوی، غلام علی، سید لعل شاہ حسینی وغیرہ سے انھیں حاصل ہوئے تھے۔

[1] یہ بیاض اب [illegible] (سالار جنگ) [illegible] ۱۹۳۲ء [illegible]

اسی بیاض میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کا اردو فالنامہ اختلافِ قرأت کے ساتھ دو جگہ لکھا ہوا ہے۔ اس کی قدامت اور صوبہ بہار کی سات سو سال کی پرانی اُردو کا اندازہ کرنے کے خیال سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے نقل کیا جائے۔ اور اُردو کی قدیم ترین "باقیات الصالحات" میں ان کا شمار کیا جائے۔

حضرت شرف الدین یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات یہ ہیں کہ صوبہ بہار کے ایک مقام منیر میں ۶۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور فردوسیہ خاندان کے بانی حضرت شیخ رکن الدین فردوسی رحمۃ اللہ علیہ ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء کے خلیفہ حضرت نجیب الدین فردوسی رحمۃ اللہ علیہ ۷۳۳ھ مطابق ۱۳۳۲ء سے بیعت ہوئے۔ وہ دہلی بھی تشریف لے گئے تھے۔ لیکن اس وقت تک حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو چکا تھا۔ بہر حال حضرت نجیب الدین فردوسی علیہ الرحمۃ سے مستفیض ہوئے۔ اور ایک مدت تک راجگیر (بہار) میں ذکر و اذکار میں مصروف رہے۔ پھر ایک زمانہ ان سے فیض پاتا رہا۔ ۷۸۲ھ مطابق ۱۳۸۱ء میں آپ کا وصال ہوا اور حضرت اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ ۸۰۸ھ مطابق ۱۴۰۶ء نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ خزینۃ الاصفیاء (جلد دوم صفحہ ۲۹۲) میں قطعۂ سالِ

وصال یوں آتا ہے :-

شیخ شرف الدین منیری رہنمائے حق — مقتدائے دین احمدؐ عالم و عامل شریف

سال ترحیلش چو جستم از خرد آمد ندا — "سالکِ کامل شریف" ہم "صاحبِ کامل شریف"

معدن المعانی، ارشاد السالکین، شرح آداب المریدین، مکتوبات وغیرہ کئی کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" (صفحہ ۱۴۴-۱۴۶) میں آپ کا ایک طویل "کبع منتر" ۳۵ سطروں کا نقل کیا ہے۔ بعض جملے مثلاً "دیس بھلا پردور" کے علاوہ مولانا سلیمان ندوی نے یہ اشعار بھی دیئے ہیں۔

لودھ، پھٹکری، مردہ سنگ — ہلدی، زیرہ ایک ایک ٹنگ

افیون چنا بھر مرچیں چار — اُرد بھر موتھا اس میں ڈار

پوست کے پانی پوٹلی کرے — نیناں پیر اپل میں ہرے[1]

اطبا کے نزدیک آنکھیں دکھ آنے کا یہ نسخہ اب بھی بہترین قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ (علی گڈھ میگزین۔ اپریل ۱۹۳۶ء صفحہ ۶۹) یہ اشعار بھی آپ کی یادگار ہیں۔

اس چار کچھ آگم آدے — آٹھ پانچ پھل ملنگے پادے

تین گیارہ پہونچے راج — نو سو سترہ کرے آکلج

شرفا گور نڈرادل بس اندھیاری رات — واں نہ پوچھے کون تمھاری جات

---

[1] نقوش سلیمانی۔ اعظم گڈھ ۱۱۲۹ء صفحہ ۸۴۔

اب ہم فالنامے کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ پہلا نسخہ یوں ہے :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؁

فالنامہ ہندی حضرت (اعدد) شرف الحق والدین یحیٰی منیری قدس اللہ سرہ العزیز۔

اول باید کہ وضو کند و در دل حاجت خواہد۔ فاتحہ و سورۂ اخلاص بر روحِ شریفِ ایشاں بخواند و در یکدم سہ سطر الف علیحدہ علیحدہ بکشد۔ بعدہٗ سہ گاں سہ گاں طرح دہد و در آخیر آنچہ باقی ماند جدا جدا سہ کند۔ بعدہٗ بر دائرہ ہذا نظر کند۔ از فضلِ الٰہی ہماں بر آید و ہماں شود دیدہ بالا کہ اہل العقل ہم حقیقتے دارد۔

س ١١١ جو من کی منسا کیجئے سو کی ہوئی ہوئے	س ١١٢ نا نہیں کتو کر نصیب لاگی ہاتھ کے	١٢١ کچھ تمھاری آس پوجے	١٢٢ من جن ڈولاؤ کرم لاگی ہاتھ ہے	١٢٣ آس تمھاری پوجے کبھو کہیں
س ١٣١ ناہیں ابھی ناہیں	١٣٢ من چنتا ہووے پاؤ پیر تہلکے	٢٣٣ نا جتیں نیکا اور کام کریے	٣٢٢ پھل پھول پاؤ پسند ہووے گا	٣١١ ابھی نا نہیں بیٹھ رہو گھر جائے
١٣٣ پیر تہا نہ ہووے تمہارے اس چنتا کریہ	٣١٢ ابھی ہووے پیر تہا کے	٣٢١ ششتی ہو جن اکتاؤ	٢١١ جو تم مانگو منسا پوجے	٢١٢ کا چت ڈولا آس تمہاری پوجے گی
٢١٣ جائے پھر پھول لیو گھر راج پاٹ	٢٢١ ابھی ناہیں جن اکتاؤ	٢٢٢ اگو چنتا ناہیں بیٹھو جائے بھر لیہ	٢٢٣ ابھی دور کام جن چاہو سو تاؤ	س ٢٣١ راج اچل کے دیا تم کوں

س ۲۳۲ اُب سکھ پاؤ گے	۳۲۳ جو من کی ہے اُس پوجے	۳۱۳ تمہارے کرم لاگی بات ہی	۳۳۱ جو من کی منسا کی سو پوجے	س ۳۳۲ ابھی نانہیں آگے ہووے گی
۱۱۳ نہیں کیوں ہووے کرم لاگی بات ہے	س ۳۱۱ نانہیں ابھی ناہیں بیٹھ رہو گھر جائے	۲۳۳ من کی چنتا سب پوری سوچ جن کرو	یا اللہ یا محمدؐ یا علیؓ	س ۳۳۳ پورے گی آس اب سکھ سدا ہووے گی چنتا ناہیں

اسی فالنامہ کا دوسرا نسخہ اسی بیاض میں اس طرح ہے :-

س ۱۱۱ جو من کا منسا سوئی ہووے ۔ ۱۱۲ جن اکتاؤ ہووے گا کاج۔

س ۱۱۳ ناہیں کینو کرہو نصیب لاگی ہے بات ۔ ۱۲۱ کچھ تمہاری آس پوجے گی۔

۱۲۲ من جن ڈولاؤ، کرم لاگی ہے بات ۔ ۱۲۳ آس تمہاری پوجے گی۔

س ۱۳۱ ناہیں ابھی تاہیں۔ ۱۳۲ جو من چنتا ہوئے پاو پیر بہاکے۔

۱۳۳ ناہیں ہے گا اور کام کرو ۔ ۲۱۱ جو من مانگو من کی منسا پوجے۔

۲۱۲ کا جیت ڈولاوہ تمہاری آس پوجے ۔ ۲۱۳ جاؤ من پور تمھکر راج ہوئے۔

۲۲۱ ابھی ناہیں ستاؤ جن اکتاؤ ۔ ۲۲۲ اکو چنتا ناہیں لیو جلائے بھرپور

۲۲۳ دُورمت جاؤ کام ہو سُبتلو ۔ س ۲۳۱ راج ابھی دیا رب تمھکوں۔

س ۲۳۲ اب لگ دن بُرے گئے اب سکھ ہوئے۔ ۲۳۳ جو من کی منت ہوئے پوجے کی اس

س ۳۱۱ ناہیں ابھی ناہیں بیٹھ رہو گھر جائے۔ ۳۱۲ نری تمہائے ہوئے تمہاری چنتا مت کرو

۳۱۳ ابھی ناہیں ہوئے گا۔ ۳۲۱ ستا ہو جن اکتاؤ۔

۳۳۱ جو من کی منسا ہوئے پوجے کہکیے اس   ۳۲۳ ناہیں لوبھ پہ ایسے کرم لاگی بات ہے

س ۳۲۳ بُرے دن گئے اب سکھ سدا ہوئے   س ۳۳۲ ابھیں ناہیں، آگے ہوئے۔

....

ان دونوں نسخوں میں جہاں جہاں "س" لکھ دیا گیا ہے اس سے یہ مراد ہے کہ وہ فقرے مولانا سید سلیمان ندوی نے نقل کیے ہیں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ فالنامے میں ۷۰۲ فقرے پائے جاتے ہیں[۱]۔ لیکن ان نسخوں میں ایک آدھ فقرہ زیادہ ہے اور خود ان دونوں کے فقروں میں کہیں کہیں اختلاف قرأت ہے۔ تاہم یہ اختلاف امتداد زمانہ کے باوجود زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ بہر حال اس فالنامے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ قریب ساڑھے سو سال کی مدت کے باوجود اس کی زبان ہماری زبان سے مختلف نہیں ہے اور ایسی نہیں ہے کہ سمجھ میں نہ آسکے۔

---

[۱] نقوش سلیمانی۔ اعظم گڈھ ۱۹۳۹ء۔ صفحہ ۹۶

اسلامی اور غزنوی علم[1]

سر بر آوردہ ہستیوں کے نشانوں اور نشانیوں کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کب سے ان کی ابتدا ہوئی۔ لیکن قدمار کی بعض چیزیں ضرور ایسی ملتی ہیں جنھیں ہم تاریخی حیثیت دے سکتے ہیں۔ چنانچہ بعض یہودی اہلِ قلم بیان کرتے ہیں کہ مغرب کی قدیم جماعتیں اور قبیلے ایسے بھی ہوئے ہیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی ایک پیشین گوئی مطابقت میں "حملہ آور بھیڑیئے"۔ "شیر ببر کے بچے" اور "جہاز" کی تصویروں سے شقۂ عَلَم کو مزین کرتے تھے۔ کہیں "اسپِ اشہب" اور "بیر گاؤ" بھی دیکھا گیا ہے[2]۔ نینوا میں قدیم خرکاگی کا کوئی نمونہ دستیاب ہوا ہے جس میں ایک شخص ایک دوڑتے ہوئے بیل پر کھڑا ہوا کمان کو چلّے پر چڑھائے ہوئے ہے۔

---

[1] معارف (اعظم گڈھ)۔ مارچ ۱۹۴۴ء۔ [2] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع یازدہم جلد ۱۳ صہ ۳۵

اور وہیں ایک نادر قدیم پتھر ملا ہے جس میں دو بیل مخالف سمتوں کو دوڑ رہے ہیں۔[1]

مشرق میں چینی حکومت کے پانچ پنجوں والے ہوائی اژدہے اور جاپان کے گل داؤدی بھی قدیم اعلام میں شمار کئے جاتے ہیں۔[2] اسی طرح مہابھارت جو پانچ سو سال قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی تک (مختلف مستشرقین کے قول کے مطابق) بنتی اور بڑھتی رہی، مختلف اعلام کا تذکرہ کرتی ہے جس سے کم از کم یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں (خواہ تصنیف کا زمانہ کچھ بھی ہو) جھنڈے کا تخیل ضرور تھا۔ چنانچہ ارجن کا ایک جھنڈا۔ قوس قزح کی تصویر کا حامل تھا،[3] اور دوسرا اندر کا۔ اس کے لڑکے ابھی مَنیو کے جھنڈے میں ہاتھی کی تصویر تھی۔[4] اور اسی طرح کرن کا جھنڈا تھا۔ اور اُس کے پھریرے کا رنگ سفید تھا۔[5] بھشم کے جھنڈے میں کھجور کا درخت اور پانچ ستارے تھے[6] اور کرشن کے جھنڈے میں گرڑ[7] یعنی عقاب کی تصویر تھی۔ گویا مختلف بہادروں کے مختلف جھنڈے تھے۔ لیکن وہ کسی جماعت یا فوج کیلئے مخصوص نہ تھے۔

---

[1] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد ۱۰ صفحہ ۴۵۱ [2] جلد ۱۳ صفحہ ۳۱۱ [3] بھشما پروا فصل ۴۶ شعر ۵۰ [4] فصل ۴۷ شعر ۸ [5] کرنا پروا فصل ۱۱ شعر ۷ [6] بھشما پروا فصل ۴۶ شعر ۵۰ [7] ڈرونا پروا فصل ۸۰ شعر ۲ چارلس اعظم (۷۴۲ء تا ۸۱۴ء) کا شاہی نشان ہنری سوم (۱۰۴۳ء تا ۱۰۵۶ء) کا عصائے حکومت اور ۱۰۸۰ء میں موزلین کا علم سب "عقاب" کی تصویر کے حامل تھے۔ مغرب کے مختلف نشانوں کیلئے انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۳ صفحہ ۳۱۲ وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔

اسلامی علم | اسلام سے پہلے عرب میں بھی اعلام کا رواج تھا، بدوی قبائل کے سردار مختلف رنگ کے علم رکھتے تھے، خود حجاز میں عقاب ایک منصب علم برداری کا تھا، جو خاندان بنی امیہ کو حاصل تھا۔ اُن کا پھریرا عموماً نیزے میں باندھا جاتا تھا۔ جس کو علم بردار فخر کے ساتھ اپنے ہاتھ میں اُونچا کئے رہتا تھا۔[۱]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف اعلام اختیار فرمائے تھے۔ مشکوٰۃ میں اس بارہ میں بعض روایتیں ہیں۔ حدیث کی اور کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ ہے، ان میں چند روایتیں پیش کی جاتی ہیں۔

عن ابن عباس قال كانت راية نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوداء ولواءه ابيض (رواه الترمذی وابن ماجه)	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رایت[۲] سیاہ تھا۔ اور لواء سفید تھا (روایت کیا ترمذی اور ابن ماجہ نے)
وعن موسیٰ ابن عبيدة مولیٰ	موسیٰ ابن عبیدہؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھ کو

---

۱ سیرۃ النبی تقطیع خورد جلد اول ص ۱۹۷، اور انسائکلوپیڈیا آف اسلام جلد اول صفحہ ۲۴۸ ملاحظہ فرمائیں۔ وفی كلام المقريزی لما ذكر رتب الرياسة فی الجاهلية ذكر ان العقاب فی الجاهلية راية تكون لرئيس الحرب فجاء الاسلام وهی عند ابی سفيان وجاء الاسلام والسدانة واللواء عند عثمان بن ابی طلحه بن ابی عبد الدار۔

۲ رایت اور لواء پر بحث آگے آئے گی اس یہاں ان لفظوں کے معنی نہیں لکھے گئے۔

محمد ابن قاسم قال بعثنی محمد بن القاسم الی البراء بن عازب یسألہٗ عن رایۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال کانت سوداء مربعۃ من نمرۃ رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد

محمد بن قاسم نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رایت کا حال دریافت کرنے کو روانہ کیا، انھوں نے فرمایا کہ وہ مربع چادر کا سیاہ رنگ تھا۔

وعن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل مکۃ ولواءہٗ ابیض رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو ان کا لوا سفید تھا۔

ان اعلام کے متعلق تفصیل ایک مخطوطہ "رسالۃ الالویہ" میں ملتی ہے۔ جو ایک عالم جاراللہ غنیمی نے مرتب کیا تھا اور جس کے ضروری اقتباسات کی نقل میرے محترم دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے خدابخش لائبریری سے بھجوائی ہے، میں ان کا بہت ممنون ہوں۔ اور اجمالاً بعض تقریریں اپنے ناقص ترجمے کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ علماء سے درخواست ہے کہ وہ میری اصلاح فرمائیں۔ اور اس سلسلہ میں مزید مواد بھی بہم پہنچائیں۔

(۱) مذکر صاحب الرسالۃ الزہراء فی جواز لبس العمامۃ

رسالہ زیر اار کے مولف نے زرد عمامہ باندھنے کے جواز میں بیان کیا،

الصفراء انه صلی الله علیه وسلم
دفع للزبیر ابن العوام رایة صفراء
وعممه بعمامة صفراء وانه صلی
الله علیه وسلم کانت له عمامة صفراء

(۲) ونص عبارة الرسالة
الزهراء فی روایة اخری عند
البخاری کان صلی الله علیه وسلم
یصبغ ثیابه بالصفرة ونزلت
الملائکة فی یوم بدر وعلیها
ثیاب صفر وعمائم صفر وکان
النبی صلی الله علیه وسلم البس
الزبیر بن العوام یوم بدر عمامة
صفراء واعطاه رایة صفراء اھ
فنزلت الملائکة لابسة
للاصفر موافقة لفعله صلی
الله علیه وسلم وللزبیر بن العوام

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر بن
العوام رضی اللہ عنہ کو زرد رایت عطا
فرمایا اور زرد عمامہ اُن کو باندھا
اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے
زرد عمامہ تھا۔

رسالہ زہرآء کی عبارت کے
الفاظ دوسری روایت میں جو کہ بخاری
میں ہے یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے
کپڑے زرد رنگتے تھے اور بدر کے دن جو
فرشتے آسمان سے اترے تھے اُن کے بھی
زرد کپڑے اور عمامے تھے۔ اور حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر بن عوام
رضی اللہ عنہ کو بدر کے دن زرد رنگ کا
عمامہ پہنایا تھا اور زرد رنگ کا رایت عطا
فرمایا تھا اور حضور کے فعل کی موافقت
اور زبیر بن عوام رض کی موافقت کیلئے فرشتے بھی
زرد لباس میں اُترے تھے۔

(۳) وعبارة الحلبی فی
سیرتہ وحمل اللواء وکان ابیض
فی غزوة بدر سعد بن ابی وقاص
واللواء ھو العلم الذی یحمل فی
الحرب یعرف بہ موضع امیر
الجیش وقد یجعل فی مقدمۃ
الجیش واول من عقد الالویۃ
ابراھیم الخلیل بلغہ ان قوماً اغار
واعلی لوط فعقد لواءً وسار
الیھم وقال بعضھم صرح
جماعۃ من اھل اللغۃ بترادف
اللواء والرایۃ ای فیہ یطلق
کل اسم علی الآخر وعن ابن اسحاق
وابن سعد ان اسم الرایۃ انما
حدث یوم خیبر

اور حلبی کی عبارت اس کی سیرت
میں یہ ہے کہ لواء کو جو سپید تھا غزوہ
بدر میں سعد بن ابی وقاصؓ اٹھائے
ہوئے تھے۔ اور لواء اس علم کو کہتے
ہیں جو لڑائی میں امیر الجیش کے مقام کی
شناخت کیلئے اُٹھایا جاتا ہے۔ اور کبھی
یہ مقدمۃ الجیش میں رکھا جاتا ہے۔ اور
پہلے شخص جنھوں نے لواء بلند کیا تھا،
وہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اُنھیں خبر پہنچی
تھی کہ ایک قوم نے لوط علیہ السلام پر حملہ
کیا تو انھوں نے لواء بلند کیا اور انکی طرف گئے۔
اور بعضوں نے کہا کہ اہل لغت کی ایک
جماعت نے تصریح کی ہے کہ لواء اور رایت
دونوں مترادف ہیں اور ایک دوسرے پر
اطلاق کئے جاتے ہیں اور ابن اسحاق اور
ابن سعد سے روایت ہے کہ رایت
کا لفظ خیبر کے دن پیدا ہوا۔ بس۔

(٤) وقد كان للنبيّ
صلى الله عليه وسلم لواء ابيض
في ستّ غزوات وُدّان وبواط
والعشيرة وبدر الاولى وبدر
العظمى وبني قينقاع وامّا في
غزوة احد فكان له ثلث
الوية كما في المواهب ولم
تعين صفتها وكذا الراية في
غزوة ذي قرد وخيبر وفتح مكة
وفي غزوة تبوك امر صلّى الله
عليه وسلم بكلّ بطن من الانصار
والقبائل العرب ان يتّخذ
اللواء وراية كما في المواهب
قال وصرح جماعة بترادف
اللواء والراية لكن روى
احمد والترمذي عن ابن عباس
كانت راية النبي صلى الله عليه وسلم

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لواء
چھ ٦ غزوات میں سفید تھا۔ یعنی ودان
(صفر سنہ ١ھ مطابق اگست سنہ ٦٢٢ء) بواط
(ربیع الاخر سنہ ١ھ اکتوبر سنہ ٦٢٢ء) عشیرہ
(جمادی الاول سنہ ١ھ۔ نومبر سنہ ٦٢٢ء) بدر الاولی
(جمادی الاخر سنہ ١ھ۔ دسمبر سنہ ٦٢٢ء) بدر العظمی
(رمضان سنہ ٢ھ۔ مارچ سنہ ٦٢٤ء) اور بنی
قینقاع (شوال سنہ ٢ھ۔ اپریل سنہ ٦٢٤ء)
میں۔ لیکن غزوہ احد (شوال سنہ ٣ھ۔ مارچ
سنہ ٦٢٥ء) میں حضور کے تین لوا تھے۔ جیسا کہ
المواہب میں ہے اور اسکی کوئی صفت
معین نہیں کی، اسی طرح (سفید) حضور
کا رایت ذی قرد (سنہ ٦ھ ٦٢٧ء) خیبر (محرم
سنہ ٧ھ۔ مئی سنہ ٦٢٨ء) اور فتح مکہ (رمضان
سنہ ٨ھ۔ جنوری سنہ ٦٣٠ء) میں بھی تھا۔ اور
غزوہ تبوک (رجب سنہ ٩ھ۔ نومبر سنہ ٦٣٠ء)
میں حضور نے حکم دیا تھا کہ انصار کی ہر شاخ

سوداء ولواءه ابيض ومثله
فی الطبرانی عن بريدة وابن
عدی عن ابی هريرة وزاد
مكتوب فيه لا اله الا الله
محمد رسول الله.

اور عرب کے قبائل کو کہ وہ اپنا لواء اور رایت
لے لیں، جیسا کہ المواہب میں ہے۔ اور
ایک جماعت نے لواء اور رایت کے
مترادف ہونے کی تصریح کی ہے۔ لیکن
امام احمد اور ترمذی نے ابن عباس رض سے
روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کا رایت سیاہ تھا۔ اور لواء سفید تھا۔ اور
اسی طرح طبرانی میں بریدہ رض سے اور ابن
عدی نے ابوہریرہ رض سے روایت کی
ہے اور اس میں اتنا زیادہ ہے کہ اس میں
کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔

(۵) وذكر ابو اسحاق
وكذا ابو الاسود عن عروة ان
اول ما حملت الراية يوم خيبر وما كانوا
يعرفون قبل ذلك الا الالوية و
الله اعلم

اور ابو اسحاق نے ذکر کیا اور اسی
طرح ابو الاسود نے حضرت عروہ بن زبیر رض
سے کہ سب سے پہلے جو رایت بلند کیا گیا
وہ خیبر کے دن تھا اور اس سے پہلے
لوگ صرف لواء کو جانتے تھے واللہ اعلم

(۶) وكتب العلامة

اور علامہ شیخ فاید ابیاری حنفی نے

الشیخ فاید الابیادی الحنفی
ما صورته الحمد لله الهادی
للصواب لا یخفی ان رسول
الله صلی الله علیه وسلم کان اذا
اراد ان یبعث سریة عقد لها
لواءً ودفعه لامیر السریة، فمن
ذٰلک انه بعث عمه حمزة فی
ثلاثین رجلا من المهاجرین و
عقد له لواء ابیض وهو اول
لواء عقد فی الاسلام وحمله ابو
مرثد خلف حمزة ومن ذٰلک انه
بعث عبیدة بن الحارث فی ستین
او ثمانین راکبا من المهاجرین و

جو کچھ لکھا ہے، اُس کے الفاظ یہ ہیں
کہ تمام تعریف اُس اللہ ہی کے لئے
ہے، جو صواب کی طرف رہنمائی کرتا
ہے، یہ مخفی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم جب کسی "سریہ[1]" کے بھیجنے کا ارادہ
فرماتے تو اُس کیلئے لواء بناتے اور وہ
لواء امیر السریہ کو عطا فرماتے۔ چنانچہ
ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب حضور
نے اپنے چچا حمزہ رضی کو تیس مہاجروں کے
ساتھ بھیجا[2] تو سفید لواء تیار فرمایا۔
اور وہ پہلا لواء تھا جو اسلام میں تیار
کیا گیا اور اُس کو ابو مرثد حمزہ رضی کے پیچھے
اٹھائے ہوئے تھے۔ اور اسی طرح حضور

---

[1] سریہ چند آدمیوں کی وہ مختصر اور مسلح جماعت ہے جو جنگ و صلح اور تبلیغ و تعلیم وغیرہ مختلف سلسلوں اور ضرورتوں کیلئے بھیجی جاتی تھی۔ [2] حضرت حمزہ رضی اللہ اور عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کے "سریے" غالباً پہلے سال ہجری ہی میں روانہ فرمائے تھے۔

عقد له لواء ابيض وحمله
المقداد بن عمرو. واما في الغزوات
فكثير ففي فتح مكة كان لواء
رسول الله صلى الله عليه وسلم
ابيض مكتوبٌ فيه بالاسود.
من برد يمانية لا اله الا الله
محمد رسول الله وفي فتح مكة
عقد الالوية ودفعها
للقبائل وفيه عقد لابي رواحة
لواء أبيض وامر بلالاً ان
ينادي من دخل تحت لواء
ابي رواحة فهو امن وعقد
لسعد لواء ثم امر عليا ان
ياخذه منه ويدفعه لابنه
قيس وفي غزوة حنين عقد
الوية ورايات وجعلها بين
المهاجرين واعطى سعد

نے عبیدہ بن حارث کو ساٹھ یعنی یا اسّی مہاجر سواروں
کے ساتھ بھیجا تو ان کیلئے بھی سفید لواء
تیار فرمایا اور اس کو مقداد بن عمرو رضؓ اٹھائے
ہوئے تھے. لیکن غزوات میں تو یہ بہت
ہیں. چنانچہ فتح مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کا لواء سفید تھا جو یمانی چادر کا تھا
اور اس میں سیاہی سے کلمۂ طیبہ لکھا ہوا
تھا. اور فتح مکہ میں حضورؐ نے بہت سے
لواء بنوائے جو قبائل کے حوالے کیے
اور اسی موقع پر حضورؐ نے ابو رواحہؓ
کو سفید لواء دیا اور حکم دیا بلالؓ کو کہ
لوگوں میں اعلان کردیں کہ جو شخص ابو رواحہؓ
کے لواء کے نیچے چلا آئیگا وہ مامون ہے.
اور حضورؐ نے سعدؓ کیلئے جھنڈا بنوایا. پھر
حکم دیا حضرت علیؓ کو کہ وہ اُن سے لے کر
اُن کے بیٹے قیسؓ کو دیدیں. اور غزوہ حنین
(شوال ۸ھ جنوری ۶۳۰ء) میں حضورؐ نے

ابن ابی وقاص راية واعطى
عمر بن الخطاب راية واعطى
لواء الخزرج للحباب بن المنذر
ولواء الاوس لاسيد بن حضير
وفي غزوة تبوك دفع لواء الاعظم
لابی بكر الصديق ورايته
العظمى لاسيد بن حضير
وراية الخزرج للحباب بن
المنذر ودفع لكل بطن من
الانصار وقبائل العرب
لواء وراية.

(٧) كان لواءه في
غزوة ودان ابيض وكان مع
عمه حمزة وفي غزوة بواط
كان ابيض وكان مع سعد بن
ابی وقاص وفي غزوة العشيرة

بہت سے لواء اور رایت بنوائے اور
اُن کو مہاجرین میں تقسیم فرمایا اور عطا کیا
سعد بن ابی وقاص رض کو ایک رایت
اور عطا کیا حضرت عمر بن خطاب رض کو ایک
رایت اور عطا کیا خزرج کا لواء حباب
ابن منذر رض کو اور اس کا لواء اسید بن
حضیر رض کو۔ اور غزوۂ تبوک میں حضور نے
بڑا لواء حضرت ابوبکر صدیق رض کو اور بڑا
رایت اُسید بن حضیر کو اور خزرج کا
رایت حباب بن منذر رض کو دیا۔ اور انصار
کی ہر شاخ اور قبائل عرب کو لواء یا
رایت عطا فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لواء
غزوہ وُدان میں سفید تھا۔ اور وہ
آپ کے چچا حضرت حمزہ رض کے ساتھ تھا۔
غزوۂ بواط میں بھی سفید تھا۔ اور وہ سعد
بن ابی وقاص رض کے ساتھ تھا اور غزوہ عُشیرہ

كان لواءه ابيض وكان مع علي
بن ابي طالب وفي غزوة بدر
الكبرى دفع صلى الله عليه وسلم
اللواء الى مصعب بن عمير و
كان ابيض وكان امامه صلى
الله عليه وسلم رايتان سوداوان
احدهما مع علي ابن ابي طالب
كرم الله وجهه اى ويقال لها
العقاب وكانت من مرطا لعائشة۔

میں بھی لواء سفید تھا اور وہ حضرت
علی بن ابی طالبؓ کے ساتھ تھا۔ غزوۂ
بدر الکبریٰ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
مصعب بن عمیرؓ کو لواء دیا اور وہ سفید
تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے
سامنے دو رایت سیاہ تھے۔ جن میں
سے ایک حضرت علی بن ابی طالبؓ
کے ساتھ تھا اور وہ عقاب کہلاتا
تھا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ
عنہا کی چادر سے تیار ہوا تھا۔

(۸) عن ابن عباس
رضي الله عنه ان النبي صلى الله
عليه وسلم اعطى عليا كرم الله وجهه
الراية يوم بدر وهو ابن عشرين
سنة وفي الهدى ان لواء المهاجرين
كان مع مصعب ابن عمير رضي
الله عنه ولواء الخزرج مع الحباب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ
سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بدر
میں رایت عطا فرمایا۔ اور وہ بیس سال
کے تھے۔ اور کتاب الہدیٰ میں ہے کہ
مہاجرین کا لواء مصعب بن عمیر رضی اللہ
عنہ کے ساتھ تھا۔ اور خزرج کا لواء

بن المنذر رضی اللہ عنہ ولواء
الاوس کان مع سعد بن معاذ
رضی اللہ عنہ وفی الامتاع عقد
صلی اللہ علیہ وسلم وھی ثلاث لواء
یحملہ مصعب ابن عمیر و
رایتان سوداوتان احداھما
مع علی کرم اللہ وجھہ والاخری
مع رجل من الانصار وفیہ
اطلاق اللواء علی الرایۃ وتقدم
ان جماعۃ من اھل اللغۃ جزموا
بترادف اللواء والرایۃ انتھی
من سیرۃ الحلبی۔

حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کے
ساتھ۔ اور اوس کا لوار سعد بن معاذ
رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ اور
الامتاع میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے تین لوار بنائے جن کو مصعب
بن عمیر لئے ہوئے تھے۔ اور دو سیاہ
رایت تھے جن میں سے ایک علی کرم
اللہ وجہہ کے ساتھ تھا۔ اور دوسرا
ایک انصاری کے ساتھ۔ اور اس میں
لوار کا اطلاق رایت پر کیا گیا۔ اور اوپر
معلوم ہو چکا ہے کہ اہل لغت کی ایک
جماعت کے نزدیک لواء اور رایت دونوں
مرادف ہیں۔ یہ بیان سیرۃ الحلبی سے
لیا گیا۔

وفی غزوۃ قینقاع کان
لواءہ ابیض بید عمہ حمزۃ بن
عبد المطلب رضی اللہ عنہ

اور غزوہ قینقاع میں حضور کا لواء
سفید تھا اور ان کے چچا حضرت حمزہ
بن عبد المطلب رض کے ہاتھ میں تھا۔

(٩) وفی غزوة احد
عقد صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث
الویة لواء الاوس وکان بید
اُسید بن حضیر ولواء المہاجرین
وکان بید علی بن ابی طالب
کرم اللہ وجہہ وقیل بید مصعب
بن عمیر۔

اور غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے تین لواء بنائے، اوس کا لواء
اسید بن حضیرؓ کے اور مہاجرین کا لواء
علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے
ہاتھ میں تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مصعب
بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں
(موخر الذکر) تھا۔

(١٠) وفی غزوة حمراء
الاسد دفع صلی اللہ علیہ وسلم
اللواء وکان معقودا لم یحمل
بعد احد لعلی بن ابی طالبؓ و
یقال لابی بکر الصدیق وفی غزوة
بنی النضیر حمل الرایة علی وفی
غزوة بدر الموعد حمل اللواء علی
رضی اللہ عنہ وفی غزوة المریسیع
دفع رایة المہاجرین الی ابی بکر
وقیل لعمار ابن یاسر ورایتہ

اور غزوۂ حمراء الاسد (سنہ ۳ھ ۶۲۵ء) میں
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لواء
کو جو بندھا ہوا تھا اور اُحد کے بعد سے
نہیں نکالا گیا تھا حضرت علیؓ کو دیا۔ اور
کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیا۔
اور غزوہ بنی نضیر (ربیع الاول سنہ ۴ھ - اگست
سنہ ۶۲۵ء) میں حضرت علیؓ نے رایت
اُٹھایا۔ اور غزوہ بدر (رجب سنہ ۴ھ
دسمبر سنہ ۶۲۵ء) میں بھی حضرت علیؓ نے
لواء اُٹھایا۔ اور غزوۂ مریسیع (شعبان سنہ ۵ھ

الانصار الی سعد بن عبادة و
فی غزوة الخندق کان له لواءان
وفی غزوة بنی قریظة کان لواءه
بید علی کرم الله وجهه وفی غزوة
قرد عقد صلی الله علیه وسلم لواء

جنوری ۶۲۷ء) میں مہاجرین کا رایت
حضرت ابوبکرؓ کو عنایت فرمایا اور بعض
کہتے ہیں کہ عمار بن یاسر کو۔ اور انصار
کا رایت سعد بن عبادہ رضؓ کو، اور
غزوۂ خندق (ذوالقعدہ ۵ھ۔ مارچ
اپریل ۶۲۷ء) میں آپ کے دو لوائے تھے
اور غزوۂ بنی قریظہ (ذوالقعدہ ۵ھ۔ اپریل
۶۲۷ء) میں حضور کا لواء حضرت علی کے
ہاتھ میں تھا۔ اور غزوۂ ذی قرد (ربیع الاول ۶ھ ۶۲۷ء) ۲
۲ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لواء مقرر فرمایا۔

(۱۱) وعن سعید بن المسیب
ان رایة النبی صلی الله علیه وسلم
یوم احد مرط اسود ورایة
الانصار یقال لها العقاب ......
ان الرایات لم تعرف الا یوم خیبر
واما تسمیة رایة الانصار یوم احد
بالعقاب ...... ان رایة تسمی
العقاب کما ان رایة النبی صلی الله علیه وسلم تسمی بذالک

اور سعید بن مسیبؓ سے روایت ہے
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رایت احد
میں سیاہ چادر کا تھا۔ اور انصار کا رایت
عقاب کہلاتا تھا۔ اور یہ کہ یہ رایت
نہیں پہچانے گئے مگر خیبر کے دن اور احد
میں انصار کے رایت کا نام عقاب تھا۔
...... اس رایت کا نام عقاب تھا جیسا
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رایت کا بھی یہی نام تھا۔

جاداللہ غنیمی کے رسالہ "الویہ" کے ان اقتباسات سے جن میں سے اکثر حدیثوں پر مبنی ہیں اسلامی علم کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل لغت کے نزدیک لواء اور رایت کے مترادف ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ صاحب مظاہر حق (طبع لکھنؤ جلد سوم ص ۳۷۵) کے نزدیک رایت بڑا علم ہے اور لواء چھوٹا۔ لیکن وہ حاشیے میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک ان کے معنی برعکس ہیں۔ لیکن اقتباس نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ لواء اس علم کو کہتے ہیں جو لڑائی میں سپہ سالار کے کیمپ میں کھڑا کیا جاتا تھا اور کبھی یہ صفوں کے آگے بھی کھڑا کیا جاتا ہے اور اقتباس نمبر ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلا اسلامی لواء (پہلے سال ہجری میں) حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا گیا جو امیر السریہ کی حیثیت سے تشریف لے گئے تھے۔ اسی طرح اقتباس نمبر ۶۔ ۸ اور ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین اور خزرج اور اوس کی جماعتوں کے لئے لواء تھے۔ اس بنا پر میرا خیال ہے کہ لواء اس علم کو کہتے ہیں جو ایک جماعت کیلئے ہو۔ اور دوسرے اقتباسات سے یہ خیال ہوتا ہے کہ رایت وہ علم ہے جس کا تعلق کسی ایک شخصیت سے ہو بہرحال مجھے اپنے اس خیال پر اصرار نہیں، بلکہ علماء سے درخواست ہے کہ وہ ان معنوں پر کچھ روشنی ڈالیں۔

سلے سیرۃ النبی (تقطیع خورد) جلد اول صفحہ ۱۹۷، ۲۹۷، ۳۴۷، ۴۱۴، ۴۴۲، ۴۷۱، ۴۹۰ وغیرہ میں بھی اسلامی علم اور علمبرداروں کا تذکرہ ملتا ہے۔

اقتباس نمبر ۶ میں دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ فتح مکہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ابو رواحہ رضی اللہ عنہ کو ایک علم (سفید لواء) عنایت فرمایا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اعلان کردیں کہ جو شخص اُس علم کے نیچے آئے گا وہ مامون ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کہیں سے دوسری اقوام نے سفید علم صلح و آشتی کیلئے اختیار کیا ہو، کیونکہ اس سے پہلے سفید علم کا یہ مقصد کسی دوسری قوم میں معلوم نہیں ہوتا۔ اقتباس نمبر ۴ میں طبرانی وغیرہ کے حوالہ سے یہ بتایا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لواء میں کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ اقتباس نمبر ۶ میں وضاحت ہے کہ فتح مکہ کے وقت لواء نبویؐ پر جو سفید تھا، سیاہی سے کلمۂ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ یہ وہ موقع تھا جبکہ رمضان (۸ھ) کے پاک دنوں میں بیت الحرام کو ۳۶۰ بتوں سے پاک کیا گیا تھا اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعلان سے خدا کے علاوہ (باطل) معبودوں سے جنگ، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں حفظ و امان حاصل کرنے کا پیام دیا گیا تھا۔ رحمت اور محافظت کے اسی پیام کا مظاہرہ وہ سفید لواء بھی تھا جس کا شقہ کلمہ طیبہ سے مزین تھا۔

اس تفصیل[۱] کے بعد غزنوی علم کے متعلق کچھ نئی چیزیں پیش کی جاتی ہیں

---

[۱] معارف (اعظم گڈھ)۔ اپریل ۱۹۴۲ء۔

اس سلسلہ میں اس عہد سے پہلے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے مختلف اعلام کا تذکرہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور ہیسٹنگز کی انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (جلد دوازدہم صفحہ ۱۴۵) میں سے کچھ مفید معلومات کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:-

— حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمان حکمرانوں نے اپنے لیے مختلف نشان اور عَلَم مقرر کیے۔ خلفائے بنو امیہ نے سفید عَلَم اور بنی عباس نے سیاہ علم اختیار کیا۔ مؤخر الذکر نے شقے عَلَم پر سفید حرفوں میں کلمۂ طیبہ بھی لکھوایا۔ علویوں نے سبز علم اختیار کیا۔ اور زنگی (۲۵۵ھ / ۸۶۹ء) نے ریشمی پھریرے پر قرآن پاک کی کوئی آیت سرخ اور سبز حرفوں میں لکھوائی۔ مصر کے فاطمی خلفاء (۲۹۷ھ / ۹۰۹ء تا ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء) نے اپنے علم میں ہلال لگایا۔ اور سرخ وزرد حریر کا ایک شیر بھی اُس میں بنوایا۔ اندلس کے الموحدین (۱۱۵۹ء) نے بھی اپنے عَلَم میں ہلال لگایا۔ لیکن ہلال مسلمانوں نے سب سے پہلے اختیار نہیں کیا۔ بلکہ ان سے پہلے روم کے عیسائی حکمرانوں کے یہاں ہلال موجود تھا اور عموماً زیبائش کیلیے مستعمل تھا۔ اس کے ساتھ پانچ ستارے بھی زیب و زینت کیلئے بنائے جاتے تھے۔ مشہور یہ ہے کہ چاند دیوی کی ایک لڑکی (Keroessa) تھی، جس نے ہلال اختیار کیا تھا۔ اُسی نے رومی سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ لیکن اوہام پرستی کی اُن خیالی داستانوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اتنا

ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ہلال زیبائش کیلیے بھی اختیار کیا جاتا تھا۔ صنعاء (یمن) کی ایک مسجد کے مینار پر ۱۲۷۰ء میں ہلال نصب کیا ہوا دیکھا گیا ہے۔ ترکوں نے جو اپنے علم کیلیے ہلال اختیار کیا ہے، اس کے متعلق انسائکلوپیڈیا بریٹانیکا (طبع یازدہم، جلد دہم ص ۴۶۲) میں یہ بیان ملتا ہے:۔

"ترکی ہلال اور ستارہ (غالبًا تھا) محمد دوم نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی فتح پر بطور یادگار کے اختیار کیا تھا۔[1] کیونکہ یہ نشان وہاں پہلے بھی تھا۔ بلکہ وہاں کی رومی حکومت کے اثر سے تو رومی گرجاؤں میں اب تک صلیب کے ساتھ ہلال دیکھا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ سکندر اعظم کے والد فلپ (Philip) نے ایک شب قسطنطنیہ کے قلعہ کی دیواریں گرانی چاہیں تو چاند نمودار ہو گیا اور محصورین کو پتہ چل گیا۔ چنانچہ انھوں نے اسے نیک فال سمجھ کر اپنی ملکہ ڈائنا (Diana) کیلئے شاہی نشان بنا لیا۔ اور پورے چاند کے بجائے ہلال کو اختیار کیا، جو غالبًا اس غرض سے ہے کہ وہ بڑھنے

---

[1] عرصہ ہوا میں نے کسی تاریخ میں پڑھا تھا کہ قسطنطنیہ کی فتح کے وقت قلعہ میں ایک ٹوپی پڑی ہوئی ملی تھی جس کو بطور یادگار کے ترکوں نے اختیار کیا۔ اور وہ ترکی ٹوپی کہلائی۔ روم کی اس شاندار فتح کی خوشی ترکوں کو کیوں نہ ہوتی جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بشارت دی تھی۔ ملاحظہ ہو مشکوٰۃ، باب آلات الجہاد۔ فصل اول۔ حدیث نمبر ۳۶۸۱۔

اور اُبھرنے پر دلالت کرتا ہے۔ بہرحال ترکوں نے اُسے بطور یادگار کے قائم کر لیا۔ اور اُن کا شاہی علم سرخ رنگ کا ہے جس میں خلیفۂ وقت کی تصویر بھی ہوتی تھی۔"

ہیسٹنگز کی انسائکلوپیڈیا (بحوالہ مذکورہ بالا) میں ترکوں کے علم کے متعلق اس خیال کی تردید کی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ سلطان مراد اوّل (م ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء) کے زمانہ میں جاں نثار جماعت نے سرخ علم اختیار کیا تھا۔ اور اس میں ہلال (بغیر ستارہ کے بھی بنا ہوا تھا۔ یہی علم سلجوقی ترکوں نے بھی اختیار کر لیا۔ اور اُس زمانے سے ترکی سلطنت میں قائم ہے۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں سے پہلے ہلال ضرور شاہی نشان میں جگہ پائے ہوئے تھا۔ ایران میں اسلام سے پہلے یزدجرد اور خسرو پرویز وغیرہ کے سکوں میں بھی ہلال اور ستارے منقوش تھے۔ اور وہاں جب عرب عمال[1] ۳۱ھ / ۶۵۱ء سے اسلامی حکومت کے علمبردار ہوئے تو انھوں نے بھی اپنے سکوں میں دوسرے رائج نقوش کے ساتھ یہ نقوش قائم رکھے۔ اس تاریخ سے ہلال اور ستارے ہمارے یہاں بھی رائج ہو گیے۔

ایران کے نشان کے متعلق ایک مفید مضمون تاریخچۂ شیر و خورشید (کسروی)

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو اوریئنٹل کالج میگزین لاہور، نومبر ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۰۔ بعد سے مکرمی پرنسپل محمد شفیع صاحب نے اس کی اطلاع مجھے دی تھی، اور میرے بزرگ استاذ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی مدظلہٗ نے اس کی نقل مجھے بھجوائی تھی۔

طہران کے رسالہ "ارمغان" (ستمبر اکتوبر ۱۹۳۰ء) میں ملتا ہے۔ جس کا ضروری خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

فاضل مضمون نگار نے پہلے شیر و خورشید کی اہمیت بتائی ہے کہ یہ زمین اور آسمان کی بہت نمایاں شکلیں ہیں۔ اور "شیر" کا مترادف لوئی (Louis) فرانس، روم اور آرمینیہ کے متعدد حکمرانوں کا نام تھا۔ اور اس نام کے بادشاہوں نے اور بالخصوص آرمینیہ کے لوئی ددم نے اپنے سکوں اور عَلَم پر شیر کی تصویر بنوائی تھی۔ اسی لوئی ددم نے تیسری صلیبی جنگ میں عیسائیوں کی مدد کی تھی۔ اس کے صلہ میں جرمنی کے بادشاہ فریڈرک بار بروسا نے اُسے تاج شاہی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ ۱۱۹۰ء میں مرگیا، تو اُس کے لڑکے نے روما کے پوپ سے سفارش کرکے اُسے ایک شاہی علم دلوادیا۔ جس میں شیر کی تصویر تھی۔ لوئی ششم نے خصوصیت کے ساتھ شیر کو اپنے خاندان کا شاہی نشان قرار دیا۔ اسی طرح خراسان کے مغلوں نے اور مازندران کے صفوی حکمرانوں نے بھی اپنے سکوں میں شیر کندہ کرایا تھا۔

بعض شعرا نے بھی علم کے شیر کے متعلق اشارہ کیا ہے۔ مولوی معنوی (م ۶۷۲ھ - ۱۲۷۳ء) کا ایک شعر ہے:-

ماہمہ شیریم و شیرانِ عَلَم — حملہ مان از باد باشد دمبدم

فخر الدین اسعد گرگانی نے پہلوی سے فارسی میں "ویس و رامین" کا

ترجمہ پانچویں صدی ہجری کے آخر[1] میں اور ملک شاہ سلجوقی (م ۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء) کے عہد میں کیا تھا۔ اُس کے چند اشعار یہ ہیں، جو ساسانی عہد کے اعلام کی ضروری اطلاع دیتے ہیں:۔

چو نر دستاں شدہ دست از درفشاں ۔۔۔ چو دیبائے درفشاں مہ درخشاں

فرازِ ہر یکے زرّیں یکے مرغ ۔۔۔ عقاب و باز با طاؤس و سیمرغ

بزیرِ ماہ در شیر آبگوں رنگ ۔۔۔ تو گفتی شیر دارد ماہ در چنگ

ہخامنشی عہد (۵۵۰ ـ ۳۳۰ ق م) میں خروس دم مرغِ زرّیں" کی تصویر عَلَم پر تھی۔ لیکن ساسانی عہد (۲۲۶ء ـ ۶۳۲ء) میں ضرور شیر اور ماہ رہے ہوں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ شاعر نے ان اشعار میں اپنے عہد کے اعلام دیکھ کر اُس زمانے کے اعلام کا تخیّل باندھا ہو، کیونکہ اُس کے ہم عصر سلجوقیوں نے تو ہلال اختیار کر لیا تھا۔

اسی طرح نظامی گنجوی کی مثنوی لیلیٰ و مجنوں جو ۵۸۴ھ / ۱۱۸۸ء میں لکھی گئی، اور اخستان بن منوچہر کے نام معنون کی گئی، ان مفید اشعار کی حامل ہے جو نوفل اور قبیلۂ لیلیٰ کی جنگ کے متعلق ہیں:۔

خورشید درفش دہ زبانہ ۔۔۔ چو صبح دمیدہ دم نشانہ

---

[1] حافظ محمود خاں صاحب شیرانی نے اس ترجمے کی تاریخ ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء دی ہے۔ ملاحظہ ہو رسالۂ "اردو" دہلی، جنوری ۱۹۴۳ء صفحہ ۴۔

گشتہ زمی از درم چو دریا ۔۔۔ سنگ ابلہ رو تر از ثریا (؟)

ہر شیر سیاہ کالیستادہ ۔۔۔ چوں مار سیہ دہاں کشادہ

شیرانِ سیاہ در دریدن ۔۔۔ دیوانِ سپید در دویدن

ان اشعار میں شیر والے علم کے متعلق اشارہ ضرور ملتا ہے۔ اور یہ یقین ہے کہ یہ اشارہ اس خیالی جنگ کے متعلق نہیں ہوگا بلکہ خود شاعر کے سامنے اپنے زمانے کے عَلَم کی تصویر ہو گی۔

آگے چل کر مضمون نگار کہتا ہے کہ شیر کا تعلق آفتاب سے بھی ہے، کیونکہ وہ بُرجِ اسد میں ہے۔ اس لیے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی گئی ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ شاہ طہماسپ صفوی نے اپنے سکوں میں شیر اور میش کو محض اس لئے ساتھ کندہ کرایا تھا کہ اس کی پیدائش کے وقت (چہارشنبہ ۲۶ ذی الحجہ سنہ ۹۱۹ھ ۔ ۲۸ جنوری سنہ ۱۵۱۴ء) آفتاب برجِ حمل میں تھا۔ پھر وہ "مختصر تاریخ دول" کا تذکرہ کرتا ہے، جس کا مصنف ایشیائے کوچک کے سلجوقی حکمران غیاث الدین کیخسرو (بن عزالدین کیکاؤس) کے بعد ہی ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں گذرا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ حکمران گرجستان کی ایک عیسائی حسینہ پہ عاشق ہوا۔

لہ خلاصۃ الاخبار (خواندمیر) ورق ۴۲۱ (الف) حبیب گنج۔ شاہ طہماسپ صفوی کا انتقال سنہ ۹۸۴ھ ۔ ۱۵۷۶ء میں ہوا۔

اور اُس کے ساتھ شادی بھی کر لی۔ لیکن اُس کی شیفتگی بہت بڑھی ہوئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی تصویر اپنے سکّوں میں بنوائے۔ لیکن امراء نے اُس کی موافقت نہ کی۔ اُس وقت اُس نے مجبور ہو کر اپنی محبوبہ کے آفتابی رخسار کی مناسبت سے مروّج شیر کے ساتھ آفتاب کا اضافہ کر دیا۔ چنانچہ اس وقت سے یہ دونوں شکلیں ساتھ ساتھ سکّوں میں کندہ ہونے لگیں اور اس قسم کا کوئی سکّہ ایسا نہیں ملا جو اس سے زیادہ قدیم زمانے کا ہو۔

پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "ایران کی جدید شاعری اور طباعت" میں سب سے قدیم روزنامہ "خلاصۃ الحوادث" مرتبہ آقا محمد باقر خاں کے پہلے صفحہ کا عکس دیا ہے، جس میں ایک شیر کی تصویر ہے۔ جس کے داہنے ہاتھ میں تلوار ہے۔ شیر کے اوپر سورج اور اُس کے اوپر تاج ہے۔ یہ روزنامہ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء سے ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء تک جاری رہا۔

غزنوی عَلَم

ہیسٹنگر کی کتاب (بحوالہ مذکورہ صفحہ ۱۴۶) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) نے ہندوستان میں غلبہ ظاہر کرنے کے لیے ہلال اختیار کیا تھا، جو یہاں کے عَلَم میں بھی ضرور قائم کیا ہوگا۔ چونکہ محمود اور اُس کے جانشینوں کو عباسی خلفاء سے خاص عقیدت تھی اس لیے

ظاہر ہے کہ یہ عَلَم بھی اُن کے عَلَم کی طرح سیاہ ہی ہوگا۔ اس کے متعلق ثبوت پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بغداد سے عَلَم بھی ملتے تھے چنانچہ سومنات کی فتح پر خلیفہ القادر باللہ (م ۴۲۲ھ / ۱۰۳۱ء) نے محمود کو القاب کے ساتھ عَلَم بھی روانہ کیا، جس سے یہ مراد تھی کہ اس علم کے متعلق جو ممالک ہیں ان میں محمود کی حکمرانی خلیفہ کو منظور ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے:-

"..... درین سال کہ سلطان از سفرِ سومنات برگشت خلیفہ القادر باللہ عباسی القاب نامہ بسلطان محمود نوشتہ لوائے خراسان و ہندوستان و نیمروز و خوارزم فرستاد۔ وسلطان و فرزندان و برادرانِ او را درآں نامہ لقبہا نہادہ، سلطان را کہف الدولہ والاسلام و امیر مسعود را شہاب الدولہ و جمال الملۃ و امیر محمد را جلال الدولہ و جلال الملۃ و امیر یوسف را عضد الدولہ و مؤید الملۃ خواند۔ دیگر نوشت کہ ہر کرا ولی عہد گردانی ما نیز آں کس را قبول داریم۔[1]

ظاہر ہے کہ جب خلیفہ کا عَلَم سیاہ ہوگا تو اُس کا بخشا ہوا عَلَم بھی اُسی رنگ کا ہوگا۔[2]

---

[1] تاریخ فرشتہ، طبع لکھنؤ ص ۳۵ [2] عباسی خلفاء سیاہ خلعت روانہ کرتے تھے جیساکہ علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "خلافت اور ہندوستان" کے (باقی صفحہ ۹۱ پر)

محمود غزنوی کے درباری شاعر فرخی (م ۴۲۹ھ / ۱۰۳۸ء) نے اُس کے بھائی یوسف (سپہ سالار ہند) کی مدح کے ایک قصیدہ میں کہا ہے :-

چتر سیہ درایتِ تو سایہ فگند رست   در ہند ہر جائے کہ حصنے و حصارے بست[1]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمود کی چتر سیاہ تھا۔[2] اور سیاہ کی صفت اغلب ہے کہ "رایت" کے ساتھ بھی ہو۔ کیونکہ محمود یقیناً عباسی خلیفہ کے زیر اثر تھا جس کا علم سیاہ تھا۔

جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ محمود کے نبیرہ سلطان ابراہیم (م ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء) کے علم میں شیر کی تصویر تھی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے عنصری (م ۴۳۱ھ / ۱۰۴۰ء) نے اسی شیر کے متعلق محمود کی مدح کے ان اشعار میں اشارہ کیا ہو :-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۰) صفحہ ۲۱، ۲۲ وغیرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے، عباسی خلیفہ کا ہودج بھی سیاہ ہوتا تھا، جیسا کہ خاقانی کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے : واں ہودج خلیفہ متوج بمارہ زرد : چوں شب کز آفتاب نمی تاج بر سرش۔ (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] انتخاب فرخی لاہور ۱۳۵۴ھ ص ۲۵۔

[2] سنجر سلجوقی کا چتر بھی سیاہ تھا، جیسا کہ اس شعر میں ہے : چو چتر سنجری رخِ بختم سیاہ باد : با فقر گر بود ہوسِ ملک سنجرم۔ ٹامس ولیم بیل نے مفتاح التواریخ آگرہ ۱۸۴۹ء ص ۶۹ میں لکھا ہے کہ یہ شعر شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۶۱ھ / ۱۱۶۶ء) کا ہے۔ اور یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ سنجر (م ۵۵۲ھ / ۱۱۵۷ء) اُن کا ہم عصر تھا۔ لیکن حمیدیہ لائبریری بھوپال کے انتخاب شعرائے متقدمین نمبر ۳۔ ورق ۳۲۳ ب) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر عراقی (م ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء) کا تھا۔

برون برد علم تو ز مغز شیراں ہوش — برون برد کرم تو ز روی پیراں چین

بدیع لفظ تو در است افتخار صدف — بہ رگ باس تو شیر ست روزگار عرین [1]

لیکن مجھے کوئی ایسا ثبوت نہیں مل سکا جس سے یقینی طور پر یہ کہا جائے کہ محمود کے علم میں بھی شیر کی تصویر تھی۔ بلکہ اُس کے درباری شعرا، بالخصوص فرخی، عنصری اور منوچہری نے کئی جگہ اس کی "شیر شکاری" کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے کہیں ان شاعروں نے محمودی علم کے شیر کے متعلق کوئی صاف تشبیہ یا استعارہ تک پیش نہیں کیا [2]۔

اب اُس کے پوتے ابراہیم کے علم کے متعلق ابوالفرج رونی کے یہاں وضاحت دیکھئے جو اس کی مدح میں کہتا ہے:-

چو شیر رایت شیر دلیر او بیدل — چو شاخ آہو شاخ درخت ادبے بر [3]

اُس کے بیٹے مسعود سوم (م ۵۰۸ھ / ۱۱۱۵ء) کے متعلق بھی یہی بات ملتی ہے اور یہی شاعر کہتا ہے:

در جہد باس او بہ شیر فلک — اگر اندر شود بہ شیر علم [4]

---

[1] دیوان عنصری لکھنؤ سنہ ۱۹۲۲ء ص ۸۹-۹۰ [2] اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مصر کے فاطمی خلفاء کے علم میں شیر تھا۔ اگر محمود کو اس بات کا علم رہا ہو گا، اور یقیناً ہو گا، تو اُس نے ہرگز اپنے علم میں شیر کو جگہ نہ دی ہو گی۔ [3] دیوان رونی چایکین ایڈیشن ص ۶۱، رونی کی تاریخ وفات ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء (؟) کے بعد قرار دی ہے۔ ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین لاہور، مئی سنہ ۱۹۳۸ء ص ۵۵.....

[4] دیوان رونی ایضاً صفحہ ۸۹۔

یہی شاعر مسعود سوم کے بھائی سیف الدولہ محمود کے متعلق بھی اسی طرح کہتا ہے:-

چنداں علم شیر برافراشت کہ بیفزود ۔ زالیشاں بفلک برج اسد بے عدد اشکال[1]

مسعود سوم کے بیٹے شیرزاد (م ٥٠٩ھ/١١١٦ء) کا علم بھی ایسا ہی تھا۔ مسعود سعد سلمان (م ٥١٥ھ/١١٢١ء) نے اُس کی مدح میں کہا ہے:-

نشست او بس کہ کرد شیراں کم ۔ شیر گردد دل بماند و شیر علم[2]

مسعود سوم کے دوسرے بیٹے بہرام شاہ[3] کے عَلَم میں بھی شیر تھا۔ سنائی (م ٥٤٥ھ/١١٥٠ء) کہتے ہیں:-

ہر کجا شاہِ ما بتافت عناں ۔ شیر رایات او شود ہمہ جاں

رائے رایاں بہ تیغ کردہ قلم ۔ نیزہ را شیر کردہ شیر علم[4]

بہرام شاہ کے درباری شاعر سید حسن غزنوی (م ٥٥٥ھ/١١٦٠ء) نے بھی اُس کے علم کے متعلق یہی کہا ہے:-

آں چناں شیر علم سر بفرازد بمثل ۔ گوئی از چشمۂ خورشید کند آب خوری

زندہ از باد شود بیدہ چوں شیر علم ۔ تکیہ بر خاک مکن خیرہ چوں نقش ایولل[5]

---

[1] دیوان رونی الغیاص ٧٧۔ [2] دیوان مسعود سعد سلمان، طہران ایڈیشن ١٣١٨ش، ص ٥٦٣۔

[3] بہرام شاہ کی تاریخِ وفات ٥٥٢ھ/١١٥٧ء ہی صحیح ہے۔ میں نے اس بادشاہ کی مکمل تاریخ لکھی تھی جو لاہور سے ١٩٥٤ء میں شائع ہوئی ہے۔ [4] حدیقہ بمبئی ایڈیشن صفحہ ٤٣ اور لکھنؤ ایڈیشن صفحہ ٦٥٩، مرتبًا۔ [5] انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ٩٣١، ورق ٤٤ (الف) اور ١٢٨ (ب) مرتبًا۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ محمود نے ہلال اختیار کیا تھا، جو یقین ہے کہ اُس کے اخلاف نے بھی قائم رکھا ہوگا جس طرح کہ بہرام شاہ کے متعلق وہی شاعر کہتا ہے:۔

مہر اگر بودے ز ذرہ رایت او مایہ دار ۔۔۔ ماہ اگر گشتے ز ماہ رایت او بہرہ ور

رباعی

من پائے بگل وز دو دست کوتاہ از جاہ ۔۔۔ بگذشت ہلال رایت شاہ از ماہ

اے شاہ ز بندہ دور کن کاہ از کاہ ۔۔۔ دور افتادم بقصد بدخواہ از راہ[1]

اور جس طرح کہ محمود کا علم سیاہ تھا، بہرام شاہ کا علم بھی سیاہ تھا۔ چنانچہ وہی شاعر کہتا ہے:۔

---

[1] انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۹۳۱ ورق ۲۱ (ب) اور ۱۸۲ (ب) ترتیباً بہرام شاہ کے پوتے خسرو ملک (م ۵۸۳ھ ۱۱۸۷ء) کے سکوں میں ہلال اور ایک ستارہ تھا۔ روجرس کی کتاب Coins of the Indian museum (کلکتہ ۱۸۹۶ء) جلد چہارم صفحہ ۱۶۱ ملاحظہ ہو۔ اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۰ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام شاہ اور اس کے بھائی ملک ارسلان وغیرہ کے (ہندوستانی) سکوں میں گائے کی تصویر اور اس کے اوپر ہندی خط میں "شری سمنت دیو" کندہ تھا میں نے تانبے کے یہ سکے حافظ محمود شیرانی صاحب کے ذاتی کتب خانے میں لاہور میں دیکھے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی رواداری کی شاندار مثال ہے۔

ای رفتہ بہ زمینِ رایت او　　دیدہ بجایت سیاہی

بہرام شاہ اے شاہ کہ از رایتِ شبرنگ　　در کوکبہ چوں زلفِ بتاں ماہ گرفتی[1]

فرخی کے کلام سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ محمود کا چتر سیاہ تھا۔

سید حسن غزنوی کے ذیل کے اشعار بتاتے ہیں کہ بہرام شاہ کا چتر بھی سیاہ تھا، اور اس کا تاج سفید تھا۔

گر ز چترِ تو شام سیاہ گردوں نخواست　　چو فرِ تاجِ تو صبح سپید کار گرفت

رتبتِ چترِ سیاہت چیست مرغ روز کور　　لاجرم تا شد ہمہ چشمش سپید از انتظار

روزے کہ برنہی تو تاجِ سپیدہ دم　　گیرد کنار سایۂ چترِ سیاہ را

ملکِ دگر دار امید زاں کہ بداد تو ید　　صبح ز تاجِ سپید، شام ز چترِ سیاہ

از تاجِ تست عکسے صبح سفید پوش　　وز چترِ تست خالے شامِ سیاہ دار[2]

---

[1] انڈیا آفس مخطوطہ ۱۳۱ ۹ ورق ۱۱ (ب) تقریباً سبھی غزنوی سلاطین کے سکوں میں (خصوصاً وہ جو غزنین وغیرہ میں رائج تھے) خلیفۂ وقت کا نام بھی کندہ ہوتا تھا۔ [2] مخطوطہ مذکورہ۔ ورق ۲۰ (ب) ۲۲ (الف) ۱۱۳ (ب) ۱۱۴ (الف) اور پیرس کا مخطوطہ سپلیمنٹ نمبر ۷۹۰ ورق ۱۰ (ب) مرتباً

بہرام شاہ کے بھائی ملک ارسلاں کی تاریخ معارف (نومبر دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء میں پیش کر چکا ہوں) اس کا چتر بھی سیاہ تھا، جیسا کہ مسعود سعد سلمان (دیوان صفحہ ۶۶۴ ۔ ۴۹۰) نے کہا ہے۔

گوید سپہر باشد و دولت سپید روے　　تا ہست چترِ ملک بملک ارسلاں سیاہ

روے دولت بچید و قصہ سپید　　روز دشمن سیاہ و چتر سیاہ

مسعود سعد سلمان نے بھی بہرام شاہ کے سیاہ چتر کا تذکرہ کیا ہے۔[۱]

آں خنجر زدودش دولت قرائے گشت	روئے عدوے او شدہ چوں چتر او سیاہ

یہ ہے غزنوی چتر اور علم وغیرہ کی تفصیل، اگر دوسرے مسلمان حکمرانوں کے شاہی لوازمات کی تفصیل دیکھنی ہو تو ذیل کے حاشیے کی کتابیں بھی بہت کچھ معلومات بہم پہنچائیں گی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۹۵) سفید تاج کے متعلق بھی اشارہ ملتا ہے ۔ آداب الحرب (لاہور نسخہ ۱۹۳ صفحہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام شاہ کے والد مسعود سوم کے چتر پر باز تھا۔ ہم پچھلے حاشیہ پر دیکھ چکے ہیں کہ سنجر کا چتر سیاہ تھا، انوری (کلیات مع، لکھنؤ، ۱۸۸۰ء صفحہ ۱۰۳) نے سنجر کے چتر کے باز کا تذکرہ کیا ہے۔

سلطان سلاطین کہ باز چترش	در معرکہ سلطان شکار باشد

لیکن حمیدیہ لائبریری کے انتخاب شعرائے متقدمین نمبر ۳ ورق ۴۵۹ (ب) میں اس شعر میں "باز چترش" کے بجائے "شیر چترش" ہے۔ [۱] بدایونی کلکتہ ۱۸۶۸ء جلد اول صفحہ ۴۴ [۲] مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی کے کرم اور معارف کی علم نوازی کی بدولت مختلف مسلمان حکمرانوں کے تخت، چتر، تاج و علم وغیرہ کے متعلق معلومات صبح الاعشیٰ ج ۳ (ص ۴۴۲، ۴۹۸، ۲۲) ج ۴ (ص ۶-۸) ج ۵ (ص ۲۰۶، ۳۴۳) میں اور مقدمہ ابن خلدون (ص ۲۸۴-۲۸۵) اور خطط مصر مقریزی جلد ۳ (صفحہ ۳۴۰-۳۴۲) وغیرہ سے معلوم ہوں گی۔ صبح الاعشیٰ سے معلوم ہوتا ہے، کہ محمد بن تغلق کے سر پر سیاہ علم ہوتے تھے جن کے درمیان ایک سنہری اژدہا بنا ہوتا تھا۔ اور اس کے میسرہ میں سرخ علم ہوتے تھے جن میں دو سنہری اژدہے بنے ہوتے تھے۔ جنگ میں سلطان پر سات چتر ہوتے تھے، امیر خسرو کی مثنوی مفتاح الفتوح (اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۲-۱۶ وغیرہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ جلال الدین فیروز شاہ کا چتر سیاہ تھا۔ اور علم میں ہلال تھا۔

ملفوظاتِ حضرت شیخ وجیہ الدین گجراتی رح

حضرت شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی علیہ الرحمہ المتوفی سنہ ۹۷۰ھ (۱۵۸۸ء) کے ملفوظات بحر الحقائق کے متعلق حکیم شمس اللہ قادری صاحب کی "تاریخ زبان اردو" (طبع لکھنؤ سنہ ۱۹۳۰ء ص ۲۴-۲۵) اور مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام" (ص ۲۵-۲۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مریدوں نے وہ مجموعہ سوال و جواب کے طرز میں مرتب کیا تھا، سوالات فارسی میں ہیں اور حضرت موصوف کے جوابات ہندی (اردو) میں۔ مجھے جناب مولانا راشد برہان پوری کے یہاں ایک مختصر مخطوطہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، جو مذکورہ بالا ملفوظات "بحر الحقائق" کے علاوہ ہے۔ اس میں ۲۴ صفحات ہیں۔ اور آخر میں یہ عبارت ہے:-

"تمت ھذا الملفوظ شاہ وجیہ الحق والدین

الخلیفہ الکامل المکمل للشیخ محمد غوث قدس اللہ

(معارف اعظم گڈھ (جون ۶۵ء)

برحمہا وافاض علینا فیضہما اٰمین اٰمین اٰمین

(کاتب الحروف محمد اسحٰق ولد مرزا محمد)

یہ کاتب مخطوطہ یعنی محمد اسحٰق اسی ملفوظہ کے مرتب (محمد) کا بیٹا معلوم ہوتا ہے۔ مرتب نے ص نمبر ۲ میں اپنا نام اس طرح دیا ہے:-

"یقول العبد الفقیر الحقیر محمد........ چوں کسے را دیدندے کہ اکثر اوقات بتلاوت می گذارد فرمودندے تلاوت کہ می کند، چرا شغل نمی کند؟ دیگرے را فرمودندے آب کہ می آرد، چرا شغل نمی کند۔"

اس عبارت کے علاوہ جگہ جگہ شطّاریہ طریقہ کے ذکر و شغل کی تاکید ملتی ہے۔ منتخب التواریخ اور سبحۃ المرجان وغیرہ کے حوالے حکیم شمس اللہ قادری اور مولوی عبد الحق صاحب کی کتابوں میں ہیں۔ لیکن حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار میں کچھ ذاتی تعلقات اور استفادات کا حال بھی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"وفات او در سنہ سبع وتسعین وتسعمایۃ و در صحن خانقاہ خود (احمد آباد) آسودہ است۔ محرّر سطور در وقتے کہ بقصد زیارت سیّد کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بداں دیار رسید، بہ ملاقات وے مستعد شد۔ و بعضے اذکار و اشغالِ سلسلۂ عالیۂ قادریہ

مشرف گردید۔ اکنوں جانشین او خلفِ صدق اوست۔
شیخ عبداللہ موصوف است بہ علم و حلم ۔ و ریاضت و عزلت
و ہمت و عفت و سائر اخلاق درویشاں۔"

(اخبار الاخیار ص ۱۵۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت وجیہ الدین اپنے شیخ حضرت محمد غوث گوالیری (المتوفی ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء) کی طرح قادریہ اذکار کی طرف بھی مائل کرتے تھے۔

مرزا محمد کے اس مخطوطے میں سوال و جواب تو نہیں ہیں، لیکن جو ملفوظات ہیں ان میں جابجا ہندی (اردو) کے فقرے ملتے ہیں۔ اردوئے قدیم کے شائقین کے لیے ایسے بعض مقامات ملفوظ کی قدیم کتابت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) می فرمودند۔ نزد ما شریعت و حقیقت است
طریقت نیست یعنی تکمیل بہ طریقت، گفتم چنانچہ آنحضرت
عہد ترک بخانۂ دینداراں کردہ اند، فقیر ہم کند، فرمودند چرا؟
آیا دنیاداران بیگانہ اند۔ دنیاداراں ! ہمیچ ہیں (ہم ہی ہیں)
(۲) می فرمودند۔ حضرت تخضر د فقیر از مجلس درس جدا شدہ

سخناں می کردیم، پرسیدہ شد افادہ بود یا استفادہ؟ فرمودند ہیں رسول کی لوک
یعنی مَن کان معموراً بفیض الرّسول لا یحتاج الی استفادۃ مِن غیرہٖ۔

(۳) می فرمودند۔ دستِ خضر محکم گرفتہ گفتم کہ حالِ گجرات (در قحط) چنیں شدہ است، لبساماں کے خواہد بود؟ بگوئید۔ گفتند آنچہ خدائے تعالیٰ اخفا کردہ است ظاہر نکیجی۔ ظاہر نکیجی۔ دست بزد در خلاص کنانیدہ بعدہٗ در مجلس درس حاضر نہ شدند۔

(۴) گفتم، بارہا میل شود کہ ایں قفص تن بشکنند، فرمودند چرا بشکنند؟ خاصا پنجرا ہی۔

(۵) سألتُ عن تفضیل الولیِ علی النّبیِ۔ فرمودند کھری ناداں۔ کھری ناداں (کھرے = پکے)

(۶) فرمودند، رات دن خدا جنو کی مدح کرے (انبیا کی تعریف و تفضیل کے سلسلے میں فرمایا تھا۔)

(۷) میاں شیخ صالح (مرید) خواستند کہ کسب کتابت کنند۔ فرمودند ما شطاریم۔ مارا کسب چہ مناسب؟ از ار ہر جا کہ بگیریم بخوریم، و در توحید مستغرق باشیم، بفعل زاہدانہ چرا مقید شویم۔ اگر قوی شبہہ باشد حیلہ کنید۔ یعنی از بقّال استقراض کنید، پرسیدم کہ اشیارا اگر مظاہر تصوّر کنیم چونست؟ فرمودند نہ نہ یوں تو ذوق نہ ہو دے۔

(۸) می فرمودند فیض حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ شاہِ مردانِ علیؓ رسیدہ وازایشاں بحضرت شیخ محمد غوث (گوالیری) قدس سرہٗ وازایشاں بمن رسیدہ و....... فرمودند فلاں درویش گفتہ کہ بایزیدؒ درمیان اولیا چنانست کہ درمیان انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، از مختلف الحرمت ـ سوال کردم فرمودند اتقیاء، وعلماء، سلاطین را بر عمل آں فتویٰ دادہ اند، باز فرمودند آنچہ روایت در فقہ یا بدچرانہ کند۔ بھونڈا ج ہو دی، سو نہ کری، (بھونڈا جو ہوئے سو نہ کرے) یعنی متفق الحرمت نباشد ـ مکرر فرمودند کہ ہر چیزے کہ متہیج ذوق وشوق باشد صوفی آں را ترک نہ کند، بملاحظہ اختلاف، بھونڈا ج ہوے سو ترک کرے۔

(۹)...... گفتم کسے را کہ کشف خود نمی شود، در اعمال چوں اختیار کند، فرمودند استخارہ مسنون منقول کند وپس گو کشف نباشد، اپنوں کوں کیا فائدہ؟

(۱۰) می فرمودند کسے کہ منکر توحید ووحدتِ وجود باشد، اورا تصور نقشِ اللہ وشغل طاقیچہ باید فرمود، چوں عمل کند، آپیں جھکہ مار کر قبول کرے گا۔

(۱۱) فرمودند کہ از مغلاں بیاموزید کہ اسپ را می خورانند و می دوانند دعوت سہ اربعین شما را کافی است تمہاری بلا ریاضت کرے۔

(۱۲) می فرمودند کہ سلوک شطاری از ہمہ سلوک اسہل واز ہمہ انفع، بارہا مردم را وصیت می کردند بتاکید کہ یک کھری یا دو کھری یا چار کھری (گھڑی)

در حضور ہر شغل می بودہ باشید۔

(۱۳) کسے گفت کہ میاں شیخ محمد فضل اللہ (برہان پوری) ترک درس کردند، فرمودند جب ترقی پکڑیں گی، آپیں درس کہیں گی۔

(۱۴) می فرمودند شیخ محی الدین ابن عربی را درامر فرعون مجتہد مخطی گفتند (کہ فرعون را مومن گفتہ بود) فرمودند شیخ عربی عجب فرشتہ بود، مثل او متقی بر زمین پیدا شدن عجب است۔ اما شیخ عربی کا تقویٰ کہاں میرا امکان کہاں (صاحب ملفوظ نے یہاں یہ مفہوم لکھا ہے کہ مرتبۂ ما زالیشاں زیادہ است)

(۱۵) می فرمودند خلفائے حضرت شاہ عالمؒ (گجراتی۔ المتوفی ۸۸۰ھ) گفتند کہ اگر خدمت کنید، فائدہ خواہد شد، میری تائیں کچھی خدمت کی جاتی۔ (خدمت کسے الحال نمی توانم کرد)

(۱۶) فرمودند، سب چھوڑ بیٹھی تو شتاب فائدہ ہو جاوے

(۱۷) می فرمودند، وہ کیا ہوئی جو احمد آباد کے بازار میں..... برہنہ اللہ اللہ گویاں بگردد۔

(۱۸) می فرمودند، میاں صبغۃ اللہ (یکے از اولیائے گجرات) چھو ددی (چھوڑ دے) یعنی مسودہ تحشیۂ شرح ملا (کہ شیخ وجیہ الدین نوشتہ بودند) لوا دیتی میرا جیو نکلی۔

(۱۹) کسے از بندہ قرض می خواست یک ہون یا دو ہون۔ حضرت

میاں عبد اللہ (پسر شیخ وجیہ الدین) مائل بر آں بودند کہ پُرتاب بدہند فرمودند تھی ایہاں رہتی ہو، یعنی با اہلِ محلہ خود بے مروتی نباید کرد۔ و در آغاز صحبت چوں زیادہ ادب از بندہ دیدند فرمودند کسے کہ تعظیم من نکند من ہم تعظیمے نکنم۔ عزیزے شاید حضرت عطا محمد در وقتِ موت آنحضرت را طلب می کردند، فرمودند ہوں مَرداں تو بھی کوئی نہ آدد، از تواضع مفرطہ و تکبر خالی بودند۔

(۲۰) و بندہ را فرمودند میاں صالح را پرسید کہ شما شراب می خورید گفتند آرے۔ فرمودند دلیوں کیاں صفتاں ہوتیاں ہیں۔

(۲۱) شکوہ کردم کم عقلی خود را، فقال مُنجہ تھی اُدُ کی عقل ھی (مجھ سے زیادہ عقل ہے۔)

(۲۲)........ قبول استدعاے مہمانی سوال کردم و گفتم کہ تفرقہ می دہد۔ فرمودند فقیر پر فرض تو نہیں........

اس مخطوطہ میں صرف مذکورۂ بالا (خط کشیدہ) فقرے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے صوفیانہ مسائل کا تذکرہ ہے۔ ردّ و سلب، توجہ و استمداد، ذکر و شغل وغیرہ کے متعلق کیفیات اور واقعات ملتے ہیں۔ حضرت شیخ کی اہلیہ "بی بی نازو" کے استغراق کا حال لکھا ہے کہ اُن کے ایک صاحبزادے کا انتقال ہوا، لیکن اُنھیں غم کا احساس بھی نہ ہوا۔ بعض متوسلین میاں ابوجی شیخ عبد الحکیم اور شیخ عبد القیوم وغیرہ کا ذکر بھی آیا ہے۔ ایک صاحبزادے

غوث اللہؒ کے متعلق لکھا ہے کہ بادشاہ اکبر اُن کو اپنے دربار میں بلا رہا تھا۔ لیکن بے نیاز باپ نے جانے کی اجازت نہیں دی۔ اسی زمانے کے سید محمد جونپوری المتوفی ۹۱۰ھ کے فرقہ مہدویہ کے متعلق ہے :۔

"می فرمودند کہ مردم مہدیہ عجب جاہلانند کہ اعتقاد ایشاں آن کہ ہر کہ بگرسنگی میرد ہماں بزرگ" می فرمودند کہ بدتر از روافض اند، می فرمودند کہ بعضے آشنایاں کہ میل بعقیدۂ مہدیہ داشتند و برہماں عقیدہ مردند توجہ کردم تابر احوالِ ایشاں مطلع شوم، احوال ایشاں رابغایت بد دیدم"۔

یہاں الفاظ کے نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر ہم صوفیائے کرام کے ملفوظات کا بغور مطالعہ کریں تو اُن کے ذاتی رجحانات کے علاوہ اُن کے عہد کے بہت سے تاریخی واقعات اور حالات کے متعلق بھی اشارات مل سکتے ہیں۔

اُردو املا کی تاریخ[1]

اِملا دراصل لفظوں میں صحیح صحیح حرفوں کے استعمال کا نام ہے۔ اور جو طریقہ ان حرفوں کے لکھنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، وہ رسمِ خط کہلاتا ہے۔ لیکن ان دونوں کی حدیں چونکہ قریب قریب ہیں، اس لئے فنِ املا کے امام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لفظوں کی صحیح تصویر کھینچنے کو املا کہا ہے اور تقریباً یہی مفہوم انشاء اللہ خاں انشاء اور غالب کے یہاں پایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان کیلئے صحیح املا کے قواعد نہایت ضروری ہیں۔ لیکن یہ جس قدر ضروری ہیں اُتنی ہی اُن سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک لفظ ایک شخص جس طرح سے لکھ دیتا ہے وہ دوسروں کے لیے سند بن جاتا ہے۔ اور جہاں کتابوں یا اخباروں میں اس کی تکرار ہوئی وہ مقبولیت حاصل کرلیتا ہے۔ اس لئے محققین کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ

[1] معارف (جون ۱۹۹۲ء)

زبان کی یکرنگی اور یکسانی کو قایم رکھنے کے لیے صحیح بنیادوں پر املا کے اصول قائم کریں تاکہ بے ضابطگی بھی پیدا نہ ہو، اور ہر شخص آسانی سے اپنی زبان لکھ پڑھ سکے۔

اس مضمون میں یہ عرض کیا گیا ہے کہ کس زمانے میں کون سے حروف کس طرح سے لکھے جاتے تھے اور ان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ چنانچہ اس کیلئے معلومات نہ صرف مطبوعہ کتابوں سے بلکہ نادر مخطوطات سے بھی حاصل کی گئی ہیں۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ صحیح صحیح چیزیں نظر کے سامنے آجائیں، تاکہ ہمارے محققین کچھ اسلاف کے اختیار کردہ اصول سے اور کچھ اپنے اجتہاد سے املا کے صحیح قاعدے منضبط کر سکیں، مولوی عبدالحق صاحب کے ذاتی کتب خانے میں فخرالدین نظامی دکنی کی ایک مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے نام سے موجود ہے، یہ ۸۲۵ھ میں مرتب ہوئی۔[1] اس لیے اس کا شمار قدیم ترین اُردو تصانیف میں ہو سکتا ہے۔ مثنوی نسخ میں ہے اور اس طرح شروع ہوتی ہے۔

گُسائیں تھیں ایک دُنہ جگ اَدار
(مالک) (سا) (آسرا)

برد بر دنہ جک تھیں دین ہار
(برابر) (دینے والا)

آکاس اُنچہ پاتال دھرتی تھیں
(آسمان)

جہاں کچھ نکو نیں تھاں ہی تھیں

[1] لیکن اس کا سنہ کتابت معلوم نہیں ہے۔

رَجَن ہار اَونکھیے رَجنہار توں   رہن ہار پچھیں رہن ہار توں

(خالق)   (آگے)   (باقی رہنے والا)

تھیں رچیا جگہ ابر اور تال تل   اوپر تھیں نہ آ کر سکی آپ بل

قلم کیا ان سون تین لکھیا بھوگ جگ   ہر کایا قلم بھاگ لکھ جرم لگ

(اکتساب)   (لنصیب)

اس مخطوطہ کی املائی خصوصیات یہ ہیں :۔

۱۔ گاف پر ایک ہی مرکز ہے اور اکثر اُس کے نیچے تین نقطے ہیں۔

۲۔ جب گاف اور چ کسی لفظ کے آخر میں آتا ہے تو اس کے ساتھ "ھ" بھی ہے۔ اور یہ بات دکنی ادب میں عام ہے۔

۳۔ یائے معروف و مجہول میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۴۔ ہائے ہوّز کی مختلف شکلوں کو بغیر کسی امتیاز کے لکھا ہے۔

۵۔ الف ساکن کے پہلے زبر ہے اور ایسے الف پر اکثر مد لکھا گیا ہے :

۶۔ ہمزۂ مکسورہ کے نیچے دو نقطے ضرور ہیں۔

۷۔ حرف نفی "نہ" کو اکثر پہلے یا بعد کے لفظ سے جوڑ کر لکھا ہے۔

پھر حضرت شمس العشاق میراں جی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۰۲ھ) کے کلام کا ایک مجموعہ جو تصوف کے متعلق ہے، کراچی میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق

صاحب کے یہاں ملتا ہے، یہ غالباً ۸۵۰ھ میں مرتب ہوا تھا۔ اس میں حضرت میراں جی" کے کچھ اشعار بھی ہیں۔ ایک جگہ "سبیل الانسان" کے ذیل میں جو اشعار ہیں ان میں سے دو یہ ہیں:۔

اپین جانیا جیون آپنا جیون وہی وہی   اسکوں دکھیت آپ گنوایا گیان کلا بھی رہی
بن بتن بنب سمایا جیسا پرکا سین پرکاس   کپر موکھ بنیا ماکپ نپادی یہ جو سہج اداس

یہ مجموعہ بھی نسخے میں ہے اور اس کی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ ک پر ایک ہی مرکز ہے۔ اور اکثر اُس کے نیچے تین نقطے ہیں۔

۲۔ یائے معروف و مجہول میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اور یہ بات تو بہت بعد تک رہی ہے۔

۳۔ "ہ" کی مختلف شکلیں اکثر دو چشمی ھ سے بنائی گئی ہیں۔ یہ چیز بھی بہت بعد تک پائی جاتی ہے۔

اسی قسم کی املائی خصوصیات حضرت شیخ بہاء الدین باجن (المتوفی سنہ ۹۱۲ھ) کے دوہروں میں بھی پائی جاتی ہیں[1]۔ بلکہ حضرت شاہ علی حسینی (المتوفی سنہ ۹۷۳ھ) کے دیوان "جواہر اسرار اللہ" میں بھی یہی چیزیں ہیں۔ مثلاً اُس میں ایک جگہ ہے:۔

"نکتۂ پنجم در تخلص"

---

[1] مولانا راشد برہان پوری کا کتب خانہ۔

کی لوک، کو نہ دکھ دھیں — جانوں جو ایسا کو بھیں
منجھ باج علیجیو کی کھیں — اے بھائیو ہون سون کر دکھیں[1]

یہ نسخہ بھی نسخ میں ہے۔

حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اورینٹل کالج میگزین (بابت اگست ۱۹۳۰ء) میں آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے اُردو فقرے اور دوہرے نقل کیے ہیں۔ پھر اسی میگزین (نومبر ۱۹۳۰ء) میں حضرت شیخ باجنؒ کے مختلف اشعار بھی نقل کیے ہیں، جن میں کئی چیزیں اہم ہیں۔ حضرت باجنؒ کے یہاں جمع مضارع کی ایک خاص شکل ہے۔ یعنی دھرنہ (دھریں کے بجائے۔ کرنہ (کریں) بلسنہ (بلسیں) ترسنہ (ترسیں) مانگتہ (مانگیں) وغیرہ جو پنجابی جمع کے مطابق ہے۔ اسی طرح پنجابی طرز کی جمع کانٹیاں (کانٹے) انکھیاں (آنکھیں) کے ساتھ ساتھ برج کی جمع کلالنہ (کلالوں) درویشنہ (درویشوں) راتنہ (راتوں) اورنہ (اوروں) وغیرہ بھی ہیں۔ فعل مستقبل میں کریسوں (کروں گا)، دیسوں (دوں گا) اترسیں (اُترے گا) بھی ہے۔ اور ہمارے موضوع املا کے لحاظ سے ان کے یہاں حسب ذیل چیزیں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ جمع اور جمع مضارع، نیز مصادر ایک "ہ" پر ختم ہوتے ہیں۔

تم، اُنَ، جنَ، ہنَ، باتوںَ، لینَ، دینَ وغیرہ بھی "ہ" پر ختم ہوتے ہیں۔

۲۔ حروف مشدد کو دو بار لکھا ہے۔

(۳) ٹ، ڈ، ڑ کیلئے کوئی امتیازی علامت نہیں ہے اور وہ ت، د، ر کی طرح ہیں۔

حضرت باجنؒ کے بعد دسویں صدی کے ختم ہوتے ہی یعنی ۱۰۰۲ھ میں مصطفےٰ تخلص کے ایک دکنی (گجراتی) شاعر نے نور نامہ لکھا تھا۔ یہ نسخہ میں اکسٹھ صفحات کا ایک رسالہ ہے جس میں تقریباً سوا چار سو اشعار ہوں گے۔ آخر میں جو اشعار ہیں اُن سے شاعر اور اُس کی تصنیف وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

فارسی تھا سو دکھنی بات — لکھا مصطفےٰ احبؐ سنکات
کوئی پیر دیکھیں کے درحال — میرے حبؐ کا یوہی خیال
یاں نی مرنا نین مجکوں جان — نور نامہ کا کیا بیان
جکوی پیر دیکھی ہوے شاد — مجھ عاجز کوں کری یاد
شیخ قطب عالم کی میں اولاد — نور نامہ کا کیا میں بنیاد
نور محمدؐ کا نور محمدؐ مین — میں بیٹھا لکھیا اوسان میں
یکہزار دو ۱۰۰۲ کلی سان جان — نور تھا قدرت کا یوں نشان
ہور بھیجو نبیؐ پر ہم صلواۃ — بی کلیمی ستی میری بات
نبی صلوا علیٰ وآلِ رسول — مجھ خادم کمین کون کرنا قبول
ھی مجکوں آپیس بھی یو نفا — تجھ ناؤں کاری ہوں مصطفےٰ

(حاشیہ: [illegible] ۱۰۰۲ھ [illegible])

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا نام مصطفےٰ ہے جو اپنے کو حضرت قطب العالم برہان الدین ابو محمد عبد اللہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۵۷ھ) بٹوہ۔ احمد آباد کی اولاد میں کہتا ہے۔ اور یہ کہ اس نے ۱۰۰۲ھ میں یہ نور نامہ فارسی سے دکھنی میں منتقل کیا۔ اُس کی شاعری کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس نسخہ کی املائی خصوصیات ضرور ہمارے موضوع کیلیے اہم ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

ا۔ کاف اور گاف دونوں پر ایک مرکز ہے، جو اس زمانہ میں عام تھا۔ (۲) ثا کیلیے نیچے تین نقطے ہیں۔ (۳) "ٹ" پر "ط" کی جگہ چار نقطے ہیں۔ (۴) "ہے" کو اکثر دوچشمی ھ سے لکھا ہے۔ اور یائے معروف و مجہول وغیرہ کا امتیاز نہیں ہے۔ ان کے علاوہ لسانی خصوصیات وہی ہیں جو دکھنی اُردو میں پائی جاتی ہیں۔ وزن اور قافیہ وغیرہ کی بھی کوئی خاص پروا نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کے عقیدت مند لوگ اوّل تو شاعر ہی نہ تھے۔ اور جو شاعری کرتے بھی تھے اُن کو اس پر فخر و ناز نہ تھا۔

اس کے بعد مُلا وجہی کا نمبر آتا ہے، جس کی مثنوی قطب مشتری اور

(حاشیہ صفحہ ۱۱۰) یہ نسخہ بھی مولوی عبد الحق صاحب کے یہاں ہے۔ راقم الحروف نے معارف (جنوری ۱۹۳۰ء) میں ولی ویلوری کی تین مثنویوں کے ساتھ سنہ ۱۰۰۱ھ کی مثنوی "پند نامہ" اور ۱۰۰۲ھ کی "اساس المصلیٰ" کا ذکر بھی کیا تھا۔

نثر "سب رس" کو مولوی عبدالحق صاحب شایع کر چکے ہیں۔ اور ان کتابوں کی لسانی اور املائی خصوصیات پر بھی اظہار رائے کر چکے ہیں۔ اس لیے اس کے بجائے اس کے معاصر ابن نشاطی کا ذکر کیا جاتا ہے، جس نے مثنوی "پھول بن" ۱۰۶۶ھ[1] میں لکھی تھی۔ یہ بھی نسخے میں ہے۔ اس میں "سبب تالیف" اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

مجھے یک دن دیا ہاتف نے آواز ۔۔۔ پرتگی داستاں کی اے سخن ساز
سخنکا آج توں کر کوہر ان سنج ۔۔۔ سخنکا کھولتا نین کیا سبب گنج
جگت کوں کی سنا تا نین یو باتاں ۔۔۔ شکر پر کی توں لکھتا نیں براتاں
تیری گفتار سوں عالم میٹھا کر ۔۔۔ دی تیری شعر کا ہر کسکوں شکر
سخنکی پھولکی تاثیر تی توں ۔۔۔ معطر کر جگت یک دھیر تے نوں
خوشی سوں آ خوشیکی ہاتھ پر آج ۔۔۔ توں کا نانکوں جگت کی عید[2] کر آج

اس کی املائی خصوصیات یہ ہیں :۔

۱۔ ٹ کے لئے چار نقطے اوپر ہیں۔ (۲) ڑ کے لیے اکثر تین نقطے نیچے ہیں مثلاً :۔

نہ ھلتا ھی نہ چلتا ہی موا تھا ۔۔۔ تمام اپنی سوں کام اس کا ہوا تھا

---

[1] ایضاً [2] ابن نشاطی کی "پھول بن" کے جواب میں ہنر نے "سیہ درپن" ۱۰۷۷ھ لکھی تھی (اردوئے قدیم از حکیم شمس اللہ قادری ص ۱۰۰) سید محمد والہ (المتوفی ۱۱۸۲ھ) نے بھی اُس کے جواب میں مثنوی "موہنی و طالب" لکھی تھی۔ والہ لکھتا ہے :۔ (روح در جسم آہو) (صفحہ ۱۱۳ پر)

(۲) اسی طرح ڈ کے بیے تین نقطے نیچے ہیں۔

نہ دیکھے کوئی تو ن آہستہ ڈگ ڈگ   چلوں اوس کا ندکی اوس کا ندکوں لگ

لیکن کہیں کہیں ڑ اور ڈ کے تین نقطے اوپر بھی ہیں۔

(۳) کہیں کہیں گاف پر دو مرکز نظر آتے ہیں، یہ کتابت اس لحاظ سے قدیم نمونہ سمجھی جائے گی۔

(۴) واو معروف کیلئے اکثر ایک سیدھا پیش دیا گیا ہے، یہ چیز خاص ہے۔

(۵) الف پر اگر مد کی ضرورت ہے تو اکثر مقامات پر دو الف لکھے گئے ہیں۔

(۶) ہائے ہوز کو ہر جگہہ دو چشمی ھ لکھا گیا ہے۔

(۷) عام دستور کے مطابق یائے معروف و مجہول میں کوئی امتیاز نہیں۔

(۸) اوس (اُس) اون (اُن) واو کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

حضرت شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید شیخ رکن الدین ابن عماد الدین کاشانی نے تصوف پر ایک کتاب فارسی میں شمائل الاتقیاء

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۲) سنیا ہوں میں قصہ اک ہور زن کا بند ھا ابن نشاطی پھول بن کا

دلے دو دلکو نمن لگتا ہے چنداں + نہ ہوتا جیو کا پھول اس مول خنداں

دالہ کی مثنوی امیر کی دریائے عشق اور مصحفی کی بحر المحبت نے ملتی جلتی ہے

کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا دکنی ترجمہ میراں یعقوب نے سنہ ۱۰۸۲ھ میں کیا تھا، وہ بھی نسخہ میں ہے۔ اور اس طرح شروع ہوتا ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد ثنا اتقیا واصفیا کی کیناں، ہور خصلتاں کی تمنّی بیحد و بی پایان ہور سرانا، بکھاننا اولیا و انبیاو کی، نیکیاں ہور صفتاں کے۔ بھانت بی کنت۔ ہور بی انت اُس ایک پاک ذات کون، واجب ہور سزاوار ہے کہ، جینی پرہیزگاراں کے، تو بی کون اپنی نزدیکی کے برائے دیا، کہ — اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ یعنی تحقیق خدا کی نزدیک برا تمنا میں او کوی ہے، جو جنی تمنا میں پری پرہیزکار ھی[1]

اس نسخے میں بھی ٹ، ڈ، گاف، ہ وغیرہ کیلیے وہی علامات ہیں جو اس سے پہلے والے نسخے میں ہیں۔ لیکن اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ فقرہ یا کلمہ وغیرہ ختم ہونے پر ہر جگہہ ایک بڑا گول (سرخ) نقطہ دیا گیا ہے، گویا اُس زمانہ سے ہماری زبان میں علاماتِ وقف نظر آتے ہیں۔

---

[1] یہ نسخہ بھی مولوی عبدالحق صاحب کے یہاں ہے، لیکن اس کے آخر میں ایک جگہہ سنہ ۱۱۵۰ھ لکھا ہوا ہے، اس کے بعد جن مخطوطات کا ذکر اس مضمون میں آئے گا، وہ اکثر مولانا راشد صاحب برہان پوری کی ملک میں ہیں۔

سنہ ۱۰۹۶ھ کی لکھی ہوئی ایک بیاض ملتی ہے، جس میں مختلف شعرا کے دوہے ہیں۔ اس کے آخر میں یہ عبارت ہے :-

"بتاریخ ۲۷ رجب المرجب سنہ ۲۸ جلوس والا بندہ درگاہ

گلاب رائے سوائی بیادگار بقلعہ سولاپور وقتے کہ در تعیہ روانہ

شدن برہان پور بود نوشت"

خطِ ما بہر یادگار ماست   صاحبِ حال بے قراریِ ماست"

ایک جگہ مالکِ بیاض کے دستخط اس طرح ہیں، "عاجز صاحب لال للاگر دھاری لال جیو" پھر یہ شعر فارسی میں ہے :-

دوائے صندل و عنبر نہ سازگارِ من ست

علاجِ دردِ سرم خاکِ پائی یارِ من ست

اس بیاض میں اہتمام خاں، احمد، افضل، فاضل، نول رام، موہن لال وغیرہ کے دوہے ملتے ہیں۔ اہتمام خاں غالباً عالمگیری امیر تھا، اُس کا ایک دوہا یہ ہے :-

ان نینن کوں مور کھا کیتی راکھوں ہور   نینن بھی سورج مکھی ہری جات پی اور

احمد کا دوہا سنیئے :-

کا کوں گھبرا دیئے کا کوں کیجے سوگ   احمد سنگ سرائے کو سبھی بتا او یوگ

افضل کا دوہا اس طرح ہے :-

گورے مکھ پر سیام تل انچ لیو جی جور　　افضل گھر میں کیا رہے پرت چاندنی چور

فاضل نے یوں کہا ہے :-

جے بھانور پی تم دیے تے ہم دیے ندان　　بھانور کے بھانور دیے فاضل دیے پران

نول رام کا دوہا بھی سنیے :-

پاتی دیکھ ہاتھ کی اودھو چونن لاگ　　نول رام درسن بنا نینن لاگے آگ

ایک دوہا موہن لال کا بھی سنئے جو غالباً مالک بیاض "صاحب لال" کا عزیز ہوگا۔ دوہا یہ ہے :-

کو جانے کا سوں کہوں کو پوچھے یہ بات　　موہن موہن لال کے سدھ آئے سدھ جات

اس بیاض کی خصوصیات یہ ہیں :-

۱- گاف کیلئے ایک خاص علامت ہے۔ یعنی ایک مرکز بنا کر اس پر چھوٹا سا ہندسہ ۲ کا بنا دیا گیا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح ہم نشان دہی کے لیے ایسا ۲ کچھ کھینچ کر بنا دیتے ہیں۔

۲- جی، پی وغیرہ دو حرفی اسماء جب یائے مدہ پر ختم ہوتے ہیں تو اُن کے آخر میں بجائے واؤ کے ہائے مختفی ہے۔

۳- مخلوطی اور غیر مخلوطی ہ میں کوئی فرق نہیں ہے :-

۴- یائے معروف کو عموماً گول ی سے لکھا ہے۔ اور درمیان میں

ایسی ی آئی ہے تو اُس کے نیچے چھوٹا الف لکھا ہے جیسے "اینچ"

۹۰۶ھ کی لکھی ہوئی جو بیاض دوہوں کے متعلق ملتی ہے اُسی سے منسلک چند اوراق ریختہ سے متعلق ہیں اور خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اوراق بھی اسی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔

آپ نے یہ مصرع تو بہت سنا ہوگا:- بیکار مباش کچھ کیا کر۔ یہ دراصل ایک قطعہ کا مصرع ہے جو اس بیاض میں موجود ہے قطعہ اس طرح ہے:-

بےکار مباش کچھ کیا کر	خونِ دلِ عاشقاں پیا کر
از رشتۂ زلفِ خویش ہردم	چاکِ دلِ عاشقاں سیا کر

اس بیاض میں ایک خاص غزل ریختے کی ہے جو امیر خسرو کی معلوم ہوتی ہے[1]۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے "پنجاب میں اُردو" (پہلا ایڈیشن ص ۱۲۷) میں امیر خسرو سے منسوب ایک غزل نقل کی ہے۔ اُس کا پہلا شعر یہ ہے:-

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر	ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھا کر

اس کا مقطع یہ ہے:-

خسرو کہے باتاں غضب دل میں نہ لاوے کچھ عجب	قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا گل لائے کر

---

[1] خسرو کا ایک دوہا سب رس ص ۲۱۸ میں ملتا ہے:-

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ	منجھ جلتے جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

قاضی فضل حق صاحب نے اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۱۷ء ص ۹۵)

میں امیر خسرو کی جو غزل نقل کی ہے اُس کا مقطع بھی اسی طرح ہے۔

خسرو کہے باتاں عجب دلبر نہ پاوے اک قدر
قدرت خدا کی یہ عجب میں جی دیا پر لائے کر

لیکن ہماری بیاض میں جو اشعار ہیں، وہ ردیف کے علاوہ قافیوں کے لحاظ

سے بھی اسی غزل سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان میں اس غزل کا مطلع بھی ہے۔

تا کے خورم خونِ جگر کا سوں کہوں دکھ جائے کے
شورے فتادہ در تنم پی دے گئے سر کلائے کے

ہر چند گفتم ای سخن لے دل بکس رغبت مکن
ان کی برہ ہے ات کٹھن بھوتا رہے سمجھائے کے

از درد تو بے جاں شدم طاقت نماندہ در تنم
کے پیت دے آوان (استعانت) کردکے یوہ لیو مولائے کے

اس کی خصوصیات بھی وہی ہیں جو دوہوں کی بیاض میں ہیں۔ یعنی:۔

۱۔ گاف کیلیے ایک مرکز اور اُس پر ، کا ہندسہ

۲۔ ایک ہ کا اضافہ، جیسے کچھ کو "کوچھ" لکھا ہے، "پی جی" وغیرہ میں

ہائے مختفی بھی ہے۔

۳۔ مخلوطی اور غیر مخلوطی ہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور ی کے استعمال میں

کسی طرح کا کوئی امتیاز نہیں ہے

سنہ ۱۱۰۴ھ میں نقل کیا ہوا سولہ ورق کا ایک رسالہ ہے جس کا نام مصنف

(ملک محمد جائسی ؟) نے "پریم کہانی" لکھا ہے:۔

کہے محمد پریم کہانی
سن لو سنتا بھیو گیانی

آخر میں یہ عبارت ہے :۔

"تمت تمام شد بتاریخ ہفتم شہر جمادی الاول ۱۱۸۱ھ

در شاہ جہاں آباد در حویلی لالہ حکومت رائے بہ اتمام رسید"۔

اس میں ۷۔۷ شعر کے بند ہیں اور تلسی داس کی راماین کی طرح ہر بند

کے بعد ایک دوہا ضرور ہے۔ ایک بند اس طرح ہے :۔

بابا یوں مہدی کر میٹھا	ملا پنتھ جو درسن دیٹھا
ناؤں پیارا شیخ برہانوں	کلپی نگر کہنہ استھانوں
ادھنہ درس کو سا ایک پاوا	الہ داد کر پنتھ لکھاوا
الہ داد جگ سدھ نویلا	سید محمد کے سکھ چیلا
جگ جگ امر حضرت خواجے	حضرت نبی رسول نواجے
دانیال تو پر گھٹ کیتھاں	حضرت خواج خضر پنتھ دیتاں

اس بند سے معلوم ہوا کہ اس رسالہ کا مصنف محمد "مہدوی" عقائد

سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس نے مہدوی فرقے کے بانی سید محمد جونپوری (المتوفی

۹۱۰ھ / ۱۵۰۵ء) کے سلسلہ کا ذکر کیا ہے کہ حضرت خواجہ خضر نے حضرت دانیال چشتی

رحمۃ اللہ علیہ کی رہبری فرمائی تھی۔ یہ بزرگ وہی ہیں جن کے نام پر اکبر نے

اپنے ایک بیٹے کا نام ۹۸۱ھ میں دانیال رکھا تھا۔ شاعر نے حضرت

دانیال چشتی کے مرید سید محمد جونپوری اور اُن کے "عشرہ مبشرہ" میں سے

ملک اللہ داد کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملک موصوف کے مرید شیخ برہان تھے۔ حالانکہ مہدوی کتابوں میں ان کو بھی سید محمد کے "عشرہ مبشرہ" میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مخطوطہ کی خصوصیات یہ ہیں:-

۱۔ مخلوطی "ھ" کو عموماً دو چشمی لکھا ہے۔

۲۔ "ٹ" پر چھوٹا "ط" لکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں ایسے "ط" کے نیچے دو نقطے بھی ہیں۔

۳۔ "گاف" پر ایک ہی مرکز ہے، اور کبھی کبھی دوسرا مرکز پیش دے کر ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ خاص چیز ہے۔

۴۔ حروف مدہ سے پہلے اگر ن ہے تو ان کے بعد نون غنہ لگا دیا گیا ہے۔ جیسے برہانوں (برہانو) استھانوں (استھانو) کینھاں (کینھا) دنیاں (دنیا) وغیرہ

غالباً گیارھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ وفات نامہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے، نہایت پاکیزہ نسخ خط میں ہے۔ اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی املا کی کئی خصوصیات کا حامل ہے۔ اُس کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

موت کوں سر پہ تھاری جانوں ۔۔۔ دنیا خواب کی باری جانوں

اُس مُی دو دروازی ہودی ۔۔۔ ایک تھی پیٹ تماشا جو دی

۱؎ راقم کے پاس مہدوی مذہب کے بانی سید محمد جونپوری کی شہادت کے متعلق ایک مثنوی دکھنی زبان میں شرف الدین کی موجود ہے۔ اس میں ملک الہ داد وغیرہ کا حال بھی ملتا ہے۔

دوجی بھیاں جب نکلے بہار — تماشا اُس کا جائے بسار
دنیا کوں بھی یوں ہیں پچھانوں — تعبیر اُس کی دل ماں آنون
تم کون کام نہ آدمی کو ہی — تو بی دل سوں دیکھو جوئی
نیکی اوپر امید دھرد — بدی کرنی تھے بھوت ڈرد

اُس کی املائی خصوصیات یہ ہیں :۔

۱۔ ٹ کیلیے چھوٹے "ط" کی جگہہ "ہ" ار نقطے ہیں، اور ڈ کیلیے د پر ایک زیر ہے۔

۲۔ جزم کو عموماً گول دائرے کی طرح لکھا ہے۔ لیکن جب ماقبل حرف مفتوح ہے، یا مجہول تو الٹا جزم شل ہلال کے ہے۔

۳۔ سوائے ایک آدھ جگہہ کے اکثر مقامات پر مخلوطی کو دو چشمی ہے سے لکھا ہے۔

۴۔ یائے معروف کیلیے مکسور حرف کے نیچے چھوٹا الف ہے۔

لسانی خصوصیات میں سے کے لیے بھیں اور تھے ملتا ہے۔ امر میں اور خصوصاً اُس وقت جب کہ واؤ سے پہلے ن ہے، تو ایسے واؤ کے بعد نون غنہ آتا ہے۔ اسی طرح "پہچانو" کے بجائے "پچانوں" ہے۔ لازم مصدر "آنا" کو متعدی بنا کر امر "آنون" بنایا ہے جیسے اس مصرع میں ہے، ع

تعبیر اس کی دل ماں آنون

اسی مصرع میں "دل میں" کی جگہہ "دل ماں" ہے، جو برج سے متعلق ہے اور

مثنوی بھی برج بھاشا کے ایک وزن میں ہے۔ کہ فعلن، فعلن، فعلن، فعلن
ہندی وزن بھی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور وفات نامہ ملتا ہے[1]، جو
۱۱۱۱ھ میں مرتب ہوا تھا، مخطوطے کے آخر میں یہ شعر ہیں:-

ہوا نسخہ یو ہجرت بعد سارا — ہوئے تھے برس اک گیارہ سو گیارہ (۱۱۱۱ھ)
دیا توں فیض کوں توفیق یا رب — کیا اس کے سبب ایر مرتب[2]

یعنی فیض شاعر نے ۱۱۱۱ھ میں اسے مرتب کیا، مخطوطہ نسخ میں
ہے، شروع کے کچھ اشعار یہ ہیں:-

بنا اول کروں حمد خدا میں — زباں اوپر الیس کی ابتدا میں
کیا قدرت سے ظاہر اپنی قدرت — بنا کر جگ دکھیا آپ اپنی حکمت
نہ تھا سو سب کیا ہر شے کو موجود — کہوایا سب کسی کا آپ معبود
دیا ہر شے کوں اپنی آشنائی — پچھانت کی دلاں میں دی صفائی
کیا نیں وصف کوئی اس کا نہایت — کوئی جانا تو اتنا ہی زیادت

---

[1] امین گجراتی نے ۱۱۰۹ھ میں مثنوی یوسف زلیخا لکھی تھی۔ اُس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ولادت نامہ بھی لکھا تھا اُس کے چند اشعار یہ ہیں:-

اس ذکر کے صدقے چلا جاوے امین اندر بہشت — عاصی کو بخشا چاہے تو بخشیں تجھے سب کچھ سکت
مطلب رہے تجھے درمیاں، من کا بیاں لولو سوں من — اگر پڑے رتھے یک گرداب گرہ کھولو سوں من

مجھے توفیق دے یارب تو بولوں — زباں ہجر نبیؐ دکھنی میں کھولوں

کہوں صلوات کہ کو بعد ازاں میں — نبیؐ جو نقل کیتے سون بیاں میں

اس نسخے کی خصوصیات یہ ہیں :-

۱- اس میں عموماً مخلوطی ہ کو دو چشمی لکھا گیا ہے، بہت کم مقامات پر اس اصول سے اختلاف ہے۔

۲- یائے معروف اور یائے مجہول میں اکثر و بیشتر آج کل کے مطابق امتیاز ہے، لیکن

۳- کاف اور گاف میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔

وؔلی گجراتی (المتوفی ۱۱۱۹ھ) اور میرؔ و سوداؔ کے عہد کی زبان میں جو اجزا مشترک تھے، اُن کے متعلق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی فرماتے ہیں :-

"بوجھنا (پہچاننا) بولنا (کہنا) پون (ہوا) پی، پیو سجن، موہن، پیونا (پینا) تجھ مجھ (تیرا میرا) جیو (جی) لگ (تلک) نین، نینن (آنکھ، آنکھیں) ستی، سیتی (سے) کنے (پاس) نپٹ، اینٹھ (بالکل، سراسر) یہ اور اس طرح کے بہت سے لفظ دکنی شاعروں کے کلام کے علاوہ دلّی، پنجاب صوبۂ متحدہ اور بہار میں اب تک بولے جاتے ہیں، کسی لفظ میں حرف علت کا گھٹ کر ایک حرکت رہ جانا یا حرکت کا کھنچ کر

حرفِ علّت ہو جانا، جیسے اُپر (اوپر) دِکھو (دیکھو) لاگا (لگا)، لوہو (لہو) اودھر، ایدھر، جیدھر، تشدید کا جاتا رہنا یا اکہرے حرف پر تشدید کا آجانا جیسے اتنا سے اتّا اور پھر اِما، اور پات سے پتّا ہو جانا۔ یہ سب صورتیں دکّی کے شاعروں کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ نونِ غنّہ پرانے زمانہ میں بہت تھا، یہاں تک کہ بعضے لوگ فارسی لفظوں کوچہ، پیچ، پاچہ کو کونچہ، پینچ، پانچہ لکھا کرتے تھے۔ .... ملفوظ ہ خاص کر دلی اور پچھاں کے اور مقامات میں اکثر بولی جاتی رہتی ہے۔ اور اس کی جگہ اکثر ایک مخلوط ی یا ہمزہ لے لیتا ہے۔ جیسے بہت کی جگہ بوت، کہتا کیلیے کیتا، کہوں (کیوں)، اسی طرح کئین یا کئیں اور دئن اور نئین عام طور پر سنا جاتا ہے۔ ..... ملفوظ ہ کہیں حذف ہو جاتی ہے۔ جیسے گھبراہٹ سے گبھراٹ اور کہیں مخلوط ہو جاتی ہے، جیسے وہاں سے وھاں، یہاں سے یھاں۔ کہیں مخلوط ہ اپنی جگہ بدل لیتی ہے، جیسے گرھنا (گھڑنا) بعضے لفظوں میں ان دونوں کا قلب اور ابدال ایک ساتھ ہوا ہے جیسے پہچان اور پچھان

پھونچا اور پونچھا۔ لفظ کے بیچ یا آخر میں سے مخلوط ھ
اکثر جاتی رہتی ہے اور بھوک (بھوکھ) تڑپ (تڑپھ) دھوکا
(دھوکھا) سامنا (سامھنا) مانجنا (مانجھنا) بھکاری،
(بھکھاری) اب سے تھوڑے دن پہلے تک دونوں طرح
سے لکھے جاتے رہے ہیں[۱]۔"

تقریباً بارھویں صدی ہجری میں گلستانِ سعدی کا دکھنی زبان میں ترجمہ ہوا۔ بندہ ہماں یہ کہ...... الخ اور اس کے بعد کی عبارت کا ترجمہ اس طرح ہے:۔

"بندہ وہ بہتر ہے کہ تقصیر سے اپنے عذر بیچ درگاہ خدا کے لاوی۔ اور نے لائق ہے، صاحبی کون اُس کے کوئی نے سکتا کہ بجا لاوی۔ رحمت بے حساب اس کا سب کے تئیں آکے پہنچایا۔ اور خوان طرح طرح کے نعمتوں بیدریغ اوس کا سب جگا کہیں چا، اور پردہ شرم بندوں کا ساتھ گناہ کے نی پھاڑتا۔ اور وظیفہ روزی کھانیوالوں کا ساتھ گناہ بد کے نے لیجاتا۔"

اس مخطوطہ میں املا سے متعلق وہ تمام خامیاں ہیں، جو اب دور ہو چکی ہیں۔

---

[۱] رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۳۵ء ص ۲۹۲۔

مثلاً یاے معروف اور مجہول کا کوئی امتیاز نہیں ہے، ک اور گ، میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پیش کیلیے ترکی کی تقلید میں واؤ کا استعمال ہے۔ جیسے "اوس" اور پہونچایا۔ مخلوطی اور غیر مخلوطی ہ کا فرق بھی نہیں ہے۔ مرکب الفاظ کہیں جڑے ہوئے ہیں اور کہیں بے جڑے ہیں۔ کہیں کہیں مفرد لفظ کے بھی ٹکڑے کر ڈالے ہیں۔ جیسے "کہیں، چا" البتہ ڑ کے لیے چار نقطے ہیں۔ اور "نہیں" کو صرف "نے" (فارسی کی طرح) لکھا ہے [1]

اسی طرح کا ایک مخطوطہ لوائح جامی کی شرح میں ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ شمالی ہند میں لکھا گیا ہے۔ اُس میں جستہ جستہ مقامات اس طرح ہیں:۔

"لائحہ نمبر ۳۔ مکاشفہ بوجھو تم کہ بیچ اس لایحہ کے تاکید کرتے ہیں واسطے مراقبۂ دائمی کی۔ اور مراد نسبت سے مراقبہ ہے کہ بیچ گذرنے لایحہ کے مراقبہ فرمائے ہیں، واقف نفس باید بود یعنی واقف اپنے دم کے چاہیے ہونا کہ ہوش دردم اس کو کہتے ہیں۔ رُخ گرچہ نمی نمائیم سال لبسال رُخ دکھانے سے رویۃ اور شہود ہے۔ سال لبسال سے مراد ہے ہمیشہ وشہود دائمی ہے۔ یعنی عاشق کہتا ہے کہ موں اگرچہ

[1] عبداللہ فتحی گجراتی کا "قیامت نامہ" جو ۱۱۴۹ھ میں لکھا گیا اسی قسم کی املائی خصوصیات پر مشتمل ہے جس میں دجّال کی دال پر چار نقطے بھی ہیں۔

میں مو کھا تا ہے تو مجھے ہمیشہ بیچ اس دنیا کے شہود دائمی محال ہے اسی واسطے یومنون بالغیب تعریف ہے بیچ حق مومنوں کے"۔

ایک جگہہ ہے کہ :۔

"فقیر تھوڑا ایک رمز بولا ہے۔ باقی اللہ سمجھایکا اپنے طالبوں کو"۔

اس مخطوطہ میں صرف ایک خصوصیت مزید یہ ہے کہ ڑ کے لیے بجائے چار نقطوں کے صرف تین نقطے ہیں۔

رحمت اللہ گجراتی جو غالباً بارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے قصیدۂ غوثیہ کا منظوم ترجمہ کرتا ہے، آخری شعر یہ ہیں :۔

قصیدۂ غوثیہ پوچھا تمامی　　مریداں تم کرو اُن کی غلامی
بیاں ہے رحمت اللہ بی لکھایت　　کرو تم سامعاں کی اب رعایت

مخطوطے کے آخر میں یہ عبارت ہے :۔

"رقیمہ میاں اسمٰعیل ساکن دھوراجی"

یہ مخطوطہ پاکیزہ نسخ میں ہے۔ اور ابتدائی اشعار یہ ہیں :۔

قدح مجھ وصل کا حقنی پلایا　　میں تب شوقِ الٰہی کون بولایا
اسی مستی نے مجھ میں جوش کیتا　　تبی یاران مینن بازی میں جیتا

املائی خصوصیات یہ ہیں :۔

۱۔ مخلوطی حروف سوائے "مجھ" کے اکثر بغیرہ کے ہیں جیسے تبھی کی جگہہ

"تھی" ہے۔ اسی طرح "پہنچا" کو "پونچا" لکھا ہے۔

۲۔ یائے معروف و مجہول میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ جس یائے ساکن کے قبل زبر ہے اس "ی" کو نصف دائرہ دیا ہے۔

بالکل انہی خصوصیات کا حامل ایک اور مخطوطہ بھی ملتا ہے، جو "ارکانِ اسلام کے متعلق ایک سو اشعار پر مشتمل ہے اور اسی شاعر کی تصنیف ہے" آخری اشعار میں شاعر کا نام آتا ہے:-

خدایا بخش سب مسلماں کوں ... کہ دنیا میں بجیں بہ ایمان سون

کہے رحمت اللہ ای رب الرحیم ... مجھے دین پر رکھ سدا مستقیم

عہدِ عالمگیری کے مشہور فارسی داں میر عبدالواسع ہانسوی نے غرائب اللغات کے نام سے ایک فرہنگ لکھی تھی۔ جس میں ایسے ہندی الفاظ دیے گئے تھے، جن کے معنی آسانی سے فارسی لغات میں نہیں ملتے۔ ۱۱۶۵ھ میں سراج الدین علی خاں آرزو نے اُس فرہنگ کی تصحیح کی اور زیادہ تر ایسے الفاظ پیش کیے ہیں جو گوالیری برج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس زبان کو وہ جگہ جگہ "افصح السنۂ ہندی" کہتے ہیں۔ عبدالواسع نے عہدِ عالمگیر کی دہلوی زبان کے جو الفاظ پیش کیے وہ بھی ہمارے موضوع کے لئے مفید ہیں۔ انھوں نے ڑ کو ڈ ہی لکھا ہے۔ مثلاً ساڈھو (ساڑھو) گڈھی (گڑھی) جھاڈ (جھاڑ) مسوڈھا (مسوڑھا) اسی طرح چلمن کو چلون، پانا کو پادنا، چڑانا کو چڑوانا،

مچلانا کو مچلا دنیا، لکھا ہے[1]۔

خان آرزو غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے دخیل الفاظ کے تلفظ اور املا کے متعلق یہ رائے دی ہے کہ وہی صورت اختیار کی جائے جو اہلِ زبان میں رواج پذیر ہو چکی ہو، اور ایسے لفظوں کے لیے اصلی زبان کی پیروی ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف آرزو کی نوادر الالفاظ میں بلکہ عبدالواسع[2] کی غرائب اللغات میں صوف کو سوف، صابن کو سابن، چاقو کو چاکو،[3] نقشہ کو نقشا غلولہ کو غلولا لکھا گیا ہے۔

مذکورہ بالا چیزوں کے علاوہ اس عہد میں زیر، زبر، پیش کے لیے حروفِ علت کا رواج ہے۔ لیکن مخلوطی ہ کا رواج نہیں ہے۔ اسی طرح یائے معروف اور

---

[1] اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۱ء ص ۱۵۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غالباً آرزو نے سب سے پہلے یعنی ۱۱۶۵ھ میں "حرف اُردو" کا لفظ زبان کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کتاب میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً

"انگوترہ در عرف اردو بمعنی حرف ناز و غرور ست و بمعنی سوراخ بینی انگیسر"

[2] رسالہ "اُردو" (جنوری ۱۹۵۱ء ص ۳۱) میرزا خاں نے بھی تحفۃ الہند میں الفاظ کا تلفظ وہی دیا ہے جو روزمرہ میں مستعمل تھا۔ ملاحظہ ہو رسالہ "ہندوستانی" جنوری ۱۹۳۵ء ص ۱۶-۲۲ [3] مخطوط غالب (مہیش پرشاد خط نمبر ۸۸) میں بھی "چاکو" کو چاک کا اسم فاعل کہا گیا ہے۔

مجہول میں فرق نہیں ہے۔ لیکن ڈ کے لیے "ط" کی علامت عربی ہ کی طرح ہے کہیں، کہیں چار نقطے بھی ہیں۔

خانِ آرزو نے ایک اور بات پر بھی زور دیا ہے۔ یعنی ہندی الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی لکھی جائے، یا نہیں؟ اس سلسلے میں گذارش ہے کہ "عالمگیر کے عہد میں فضائل خاں کے عرض کرنے پر کہ ہندی رسم الخط میں اسم و کلمہ کے آخر میں ہ نہیں آیا کرتی، بلکہ الف ہوتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ کو الف کے ساتھ لکھا جائے۔ عالمگیر نے یہ تجویز پسند کی اور حکم دیدیا کہ آیندہ ایسے کلمے الف کے ساتھ لکھے جائیں۔ یعنی مالوہ کو مالوا، بنگالہ کو بنگالا...... اس فرمان کی تعمیل نہ صرف شاہی دفاتر اور ٹکسالوں میں ہوئی بلکہ اردو خواں لوگوں نے بھی یہی املا اختیار کر لیا۔[۱] خانِ آرزو نے اس عالمگیری فرمان پر محاکمہ کیا ہے، لکھتے ہیں :-

"بداں کہ ایں قسم لفظ کہ آخر آں ہائے مختفی بود، فارسیاں آں را بہائے مختفی تلفظ کنند و ہندیاں با الف مثلاً بنگالا و مالوا و روپیا کہ زر رائج ہندوستان ست آنہا بنگالہ و مالوہ و روپیہ گویند و نویسند، چنانچہ از کلام اساتذہ و محاورۂ اہلِ زبان بہ ثبوت رسید۔ پس در ہندی ایں قسم الفاظ را بہ ہائے مختفی

---

[۱] پنجاب میں اردو۔ (مقدمہ)۔ ماثر الامراء (جلد ۳ - ص ۲۹)

خواندن غلط باشد و در فارسی بہ الف، وانچہ در عہدِ عالمگیری
این قاعدہ برہم خوردہ بود و در دفاتر بنگالہ و مالوہ وغیرہما
بہ الف می نوشتند محض غلط و منشار آں غفلت از تحقیق است[1]

بات صرف یہ ہے کہ بعض شعرائے ایسے الفاظ کا قافیہ ہائے مختفیہ
والے الفاظ کے ساتھ باندھا ہے۔ اس لیئے خانِ آرزو نے یہ حکم لگایا ہے۔

ورنہ یہ حقیقت ہے کہ وہ ہندی الفاظ جو الف پر ختم ہوتے ہیں محض عربی
اور فارسی کی تقلید میں ہائے مختفی سے نکھے گئے تھے۔

تاریخ غریبی جو سنہ ۱۱۰۹ھ میں لکھی گئی اس میں املا کی خصوصیات
یہ ہیں :-

۱۔ ٹ کے لیے چار نقطے اوپر دیے گئے ہیں۔ مثلاً باٹ، ٹھور۔

۲۔ ڈ، ڑ کے لیے پ اور چ کی طرح تین نقطے نیچے دیے گئے ہیں
جیسے ڈال، جھاڑ، لڑکا۔

۳۔ ہندی کے .... کے لیے "نڑ" لکھا گیا ہے۔ جیسے کھانا کو کھاڑا
دانہ کو داڑا۔

۴۔ یائے معروف و مجہول ہائے ہوز اور دوچشمی کاف اور گاف میں
کوئی فرق نہیں ہے۔

---

[1] رسالہ اردو۔ جنوری سنہ ۱۵ء ص ۳۰۔

۵۔ عربی اور فارسی الفاظ جو ہ پر ختم ہوتے ہیں الف سے[1] لکھے گئے ہیں
مثلاً:۔ قصا، حصا، خزانا، پیشا، اندیشا، ہمیشا وغیرہ[1]

اسی زمانے میں یعنی بارہویں صدی ہجری اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں طباعت کا سلسلہ ہندوستان میں شروع ہوا، علامہ عبداللہ یوسف علی نے کلکتہ گزٹ کا پہلا نمبر مورخہ ۴ر مارچ ۱۷۸۴ء دیکھا تھا، جس میں "خلاصۂ اخبار، دربار معلّٰی یہ دار الخلافت شاہ جہاں آباد" کے عنوان سے ایک کالم فارسی ٹائپ میں چھپا ہوا تھا[2]، یہ دراصل مغل شاہنشاہ کے دربار میں "واقعہ نویس" کا روزنامچہ تھا، جس کے روزمرہ کے واقعات فارسی کے مقابل کالم میں انگریزی ترجمے کے ساتھ شایع ہوتے تھے۔ پھر یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد شروع ہوا۔ یعنی منشی سدا سکھ کی ادارت میں ۲۸ر مارچ ۱۸۲۲ء میں سماچار درپن کا فارسی ایڈیشن "جام جہاں نما" کے نام سے شایع ہوا جس میں آدھا حصہ فارسی میں اور آدھا اُردو میں ہوتا تھا۔ یہ پہلا اُردو اخبار تھا۔ پھر ۱۶ر مئی ۱۸۲۳ء کو ماتھر موہن متر کی ادارت میں "شمس الاخبار" شایع ہوا۔ وہ بھی آدھا فارسی میں اور آدھا اُردو میں ہوتا تھا[3]۔ تاہم اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں نستعلیق ٹائپ کا جو نمونہ[4] دستیاب ہوتا ہے اس میں املائی

---

[1] اورنیٹل کالج میگزین (نومبر ۱۹۳۸ء ص ۱۱) [2] بحوالہ اُردو رسم الخط (محمد سجاد مرزا ص ۱۳)
[3] نوائے ادب" بمبئی بابت اپریل ۱۹۵۰ء [4] اُردو رسم الخط صفحہ ۱۶ کے مقابل والا عکس۔

خصوصیات یہ ہیں:-

۱- یاے ساکن کے پہلے اگر زیر آتا ہے تو اُسے لفیف دائرہ دیا گیا ہے۔ جیسے ہی، شی

۲- یاے معروف و مجہول میں گول اور لمبی یے والا فرق ہے۔

۳- مخلوطی ھ جو ہندی کی ہے اُسے دوچشمی ھ سے لکھا گیا ہے۔

۴- ٹ وغیرہ کے لئے موجودہ ٹائپ کی طرح دو نقطے اور اُن کے اوپر ایک ڈیش (چھوٹا خط) لگا دیا گیا ہے۔

یہی اُصول بعد میں فورٹ ولیم کالج والوں کی کتابوں میں رائج ہوئے تاہم اٹھارہویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہی یعنی ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں انشا نے "دریاے لطافت" لکھی اور اس کتاب میں املا کے لیے یہ اصول بھی پیش کیے ہیں:-

"کبھی امر حاضر مفرد پر ہمزہ اور یاے مجہول زیادہ کر کے جمع بناتے ہیں، جیسے اُٹھیے، کبھی ہمزہ سے پہلے جیم مکسور (فعل متعدی میں) بڑھاتے ہیں۔ جیسے کیجئے، لیجیے، دیجیے...... (لیکن یہاں) جیم وغیرہ کے بعد ہمزہ کا حذف...... جائز بلکہ زیادہ فصیح ہے۔"[1]

اس بات پر انشا نے زور دیا ہے کہ کیجے لیجیے وغیرہ پہ ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے۔ اور حقیقت بھی ہے کہ ہمزہ اور یے کا تلفظ "اے" ہوتا ہے،

---

[1] دریاے لطافت (انجمن ترقی اردو ص ۲۰۰-۲۰۱)

یے نہیں ہوتا، جو مطلوب ہے۔ لیکن اس اصول پر نہ صرف انشاؔ نے زور دیا ہے، بلکہ ہم نے دکن کے متعدد مخطوطات میں ایسی جگہ ہمزہ نہیں دیکھا[1]۔ ہمارے پاس ایک مثنوی "جنگ بدر" کے متعلق ہے اُس میں ایسے مقامات پر کہیں ہمزہ نہیں ہے۔ مثلاً

لگا پوچھنے کون ہے کیوں اضطراب ۔۔۔ دیے اوس کوں عباس نے یوں جواب

دیے اُس کوں انکار سیتی جواب ۔۔۔ کہا پھر وہ ملعون نے کر یوں خطاب

۲۔ پھر انشاؔ فرماتے ہیں کہ:۔

"ایدھر، کیدھر، اودھر (اوس وغیرہ) کو..... کتابت میں ضمّے کی رعایت سے واؤ اور کسرے کی رعایت سے ی لکھ دیتے ہیں اور بعضے نہیں لکھتے۔ صحیح وہ ہیں، جو نہیں لکھتے، کیونکہ اگر ترکی کے قاعدے کے مطابق حرفِ مضموم کے بعد 'واؤ' اور حرفِ مکسور کے بعد 'ی' لکھنا ضروری ہے، تو حرفِ مفتوح کے بعد 'الف' بھی لکھنا چاہئے۔ (لیکن) ایسا نہیں ہوتا، چناں چہ رہا، کہا، چلا کو (ترکی کی تقلید میں) راہا، کاہا، چالا، نہیں لکھتے (تو پھر بلا وجہ) اُردو میں ترکی کی ٹانگ توڑنے کے کیا معنی؟ (اسی طرح

---

[1] لیکن شمالی ہند کے مخطوطات میں یہ بات موجود ہے۔ مثلاً ہمارے پاس نوطرز مرصع کا قلمی نسخہ جو ۱۲۰۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف اس طرح کے ہمزہ کے ساتھ ہی بلکہ دوسری املائی خامیوں کا بھی حامل ہے۔

لفظ اِس (اشارۂ قریب) میں یا سِنیں لکھتے، لفظ اُس میں واؤ لکھتے ہیں، اِس بیچارے نے کیا قصور کیا ہے، کہ بغیر یا کے لکھتے ہیں[۱]......، اس گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ اُس اور ایسے تمام اردو لفظوں میں جن میں ضمہ بغیر واؤ کے آواز دیتا ہے، واؤ کا لکھنا صحیح نہیں، ایسا ہی حال وی کا ہے، جس حرف کے بعد تلفظ میں اس کا اظہار ہو تو کتابت بھی درست ہے ورنہ غلط[۲]"

۳۔ انشاء کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جن ضمائر کے بعد ہی مستعمل ہوتا ہے، وہاں ہی کو مستقل جزو کے بجائے ادغام کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ "انھیں سے" اصل میں "اُن ہی سے" ہے۔ لیکن اب نقل کا استعمال اصل سے بہتر سمجھا جاتا ہے[۳]۔

۴۔ چوتھی چیز انشاء کے نزدیک یہ ہے کہ جس لفظ کے آخر میں الف (یا ہ) ہو اور اُس کے بعد حروف جارہ، فاعلیت، مفعولیت اور اضافت کی حالت میں آئیں تو وہ الف (یا ہ) یے سے بدل جائے گا۔ اور یہ تبدیلی دراصل متغیرات میں داخل نہیں[۴]"

---

[۱] بعض قدیم مخطوطات میں "اسے" کی جگہہ "ایسے" دیکھا گیا ہے۔ رنگین کی قلمی مثنوی "ایجاد رنگین" (مملوکہ مولانا رحمن علی مرحوم ریاست ریواں) میں بھی ہے۔

طول اپنے رنگین ایسے اب دیجے گیا   الغرض اپنا بھی ہے کچھ مدعیا

[۲] دریائے لطافت ص ۲۲۷، ۲۲۹۔ [۳] ایضاً ص ۳۰۶، [۴] ایضاً ص ۳۰۶۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ہم "ایک لڑکا نے" کے بجائے "ایک لڑکے نے تو لکھتے ہیں، لیکن "اس معاملے میں" کے بجائے "اس معاملہ میں" لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔

۵۔ پانچویں چیز انشا کے یہاں (مفرد اور جمع کے بیان میں) یہ ہے کہ اردو الفاظ کے آخر میں "ہ" کے بجائے الف ہی ہونا چاہیے۔ مثلاً پیڑا، کیلا، اندرسا کھیرا، چیتا، پپیہا وغیرہ کو وہ الف سے لکھتے ہیں[1]۔

یہ وہی چیز ہے جس کے متعلق ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ عالمگیر نے فضائل خاں کی تجویز پر حکم جاری کیا تھا۔ پھر اسی پر خان آرزو کا محاکمہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔

انشا کے بعد غالب نے املا کے اصولوں پر زور دیا ہے۔ چنانچہ وہ بار بار اپنے شاگردوں اور عقیدتمندوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ مثلاً منشی بہاری لال مشتاق کو لکھتے ہیں :-

"یہ تقلید اور انشا پردازوں کی۔ تمھاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو جا بجا آگاہ کرتا ہوں خدا چاہے تو املا کی غلطی کا ملکہ بالکل زائل ہو جائے[2]۔

قدر بلگرامی کو بھی لکھتے ہیں کہ :-

"صاحب تم نے مثنوی خوب لکھی ہے۔ کہیں املا میں کہیں انشا میں

---

[1] دریائے لطافت ص ۲۳۶ [2] اردوئے معلّٰی مبارک علی ص ۳۲۸

جو اغلاط تھے دُور کیے اور ہر اصلاح کی حقیقت اُس کے تحت میں لکھ دی۔[1]

غالبؔ کے بعض اصول یہ تھے:۔

۱۔ وہ ذ کو عربی حرف سمجھتے تھے۔ اس لیے فارسی اور ہندی لفظوں [میں] ث، ح، ص، ض، ط، ظ، ع بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ لیکن "ذ" کو [غ]الب نے معلوم نہیں کس وجہ سے فارسی لفظوں سے خارج کیا۔ جب کہ وہ نذر [او]ر آذر (آتش) اور کاغذ میں لکھا جاتا ہے۔ اس حرف کے متعلق صحیح تحقیق ڈاکٹر [محمد] عبد الستار صدیقی کی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

"گذشتن، گذاشتن، پذیرفتن یہ سب ذال سے ہیں، البتہ گزاردن زے سے صحیح ہے۔ مرزا غالبؔ نے پہلے نادانی سے پھر سخن پروری اور سینہ زوری سے ذال کو فارسی سے خارج کرنے کی کوشش کی، اردو میں یہ لفظ زے سے لکھیے، تو مضائقہ نہیں مگر فارسی میں ذال لکھنا ضروری ہے۔"[2]

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ اُردو والوں نے [خ]واہ مخواہ بھی ذال کو لکھنا چاہا ہے۔ مثلاً بحر زخّار کو بہت سے لوگ ذال سے

---

[1] اردوئے معلّٰی۔ مبارک علی ص ۴۱۰ [?]۔ [2] دیباچۂ مکاتیب غالبؔ (عرشی ص ۲۲۴) فارسی [م]یں ذال اور دیکھیے: گر نو عیسیم [?] ترا کیے تعویذ پاک ذ ار اے جوان مدار پلید (حدیقۂ سنائی طبع لکھنؤ ص ۱۴)

لکھتے ہیں، حالانکہ زے سے صحیح ہے۔" اور امنڈتا ہوا چڑھا ہوا" کے معنی میں آتا ہے۔ بعض لوگ زکریا کو بھی ذال سے لکھ دینے میں تامل نہیں کرتے، ذات بمعنی "قوم و نژاد" دراصل سنسکرت जाति سے بنا ہے، اُسے بھی ذات (شخصیت) یعنی ذال سے لکھتے ہیں۔ یہی حال آزوقہ کا ہے جسے غلطی سے ذال سے لکھ دیا جاتا ہے، ذرہ بمعنی "تھوڑا اور کم" سے ہم نے ایک لفظ "ذرا" بنا لیا جو معنی تلفظ اور استعمال میں مختلف ہو گیا۔ اس لئے زے سے لکھنا بہتر ہے۔ حالانکہ غالب سے پہلے رنگین تو اس نئے معنی میں بھی "ذرہ" لکھتے تھے۔ مثلاً ع

ذرہ اس تاگے کو تو دینا ہلا[۱]

۲۔ اورنگ زیب اور انشا کی طرح غالب کا اصول یہ تھا، اور یہ صحیح تھا کہ جن لفظوں کی اصل فارسی یا عربی نہیں ہے ان میں مختفی ہ نہیں آسکتی۔[۲]

۳۔ تیسری چیز غالب نے یہ قائم کی کہ فارسی کے لفظ بھی جب اُردو محاورے میں آئیں تو ان کو الف سے لکھنا چاہیے۔ جیسے "اور مزا یہ کہ" لیکن مزہ طعام وغیرہ موقعوں پر وہ بے شک مختفی ہ لکھتے تھے[۳]

---

[۱] رنگین نے "ذرا" بھی دوسرے معنی میں استعمال کیا ہے۔ حرص کے دانتوں کو لب سے تیز کر۔ صحبت بد سے ذرا پرہیز کر (حکایت یہودی، ایجاد رنگین) مولانا احسن مارہروی نے رسالۂ فصیح الملک ۵ شمارہ ۱۹۰۵ء میں "ذرا" کی تائید کی ہے۔ [۲] رسالہ ہندوستانی جولائی ۱۹۳۸ء۔

[۳] ایضاً۔ اسی طرح عربی لفظ بھی جب اپنی حقیقت بدل دیں تو انھیں بھی اردو کے مطابق لکھیں (باقی صفحہ ۱۳۹ پر)

۴۔ چوتھی چیز جس پر غالب بہت زور دیتے تھے وہ یائے تحتانی کے متعلق ہے۔ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:-

"صاحب دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو..... غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو یائے تحتانی تین طرح پر ہے۔ (۱) جزو کلمہ :- ع "ہمائے بر سر مرغاں ازاں شرف دارد" اور :- "اے سر نامہ نام تو عقل گرہ کشائے را" یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے، جزو کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا عقل کو گالی دینا ہے۔ (۲) دوسری یائے تحتانی مضاف ہے، صرف اضافت کا کسرہ ہے ہمزہ وہاں بھی مخل ہے۔ جیسے آسیائے چرخ، یا آشنائے قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی، کسی طرح کا کسرہ ہو ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدائے تو شوم رہنمائے تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ (۳) تیسری دو طرح پر ہے، یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح توحید و تنکیر، وہ مجہول ہوگی۔ مصدری (کی مثال) آشنائی یہاں ہمزہ ضرور بلکہ نہ لکھنا عقل کا قصور، توحیدی (کی مثال) آشنائے یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ

(حاشیہ صفحہ ۱۳۸) چنانچہ طیار کو تیار لکھنے کی تاکید کی ہے۔ (خط بنام قدر بلگرامی)

نہ لکھوگے دانا نہ کہاؤ گے۔......... خستہ، بستہ، غازہ، خانہ...

وغیرہ ہزار لفظ ہیں کہ اُن کے آگے جب یائے توحید آتی ہے تو

اُس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ (اسی طرح) زرہ،

گرہ، کلاہ، شاہ..... ایسے الفاظ کے آگے اگر تحتانی آتی ہے

تو زرہی، گرہی، کلاہی، شاہی..... لکھ دیتے ہیں[1]۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو لفظ مختفی ہ پر

ختم ہوتے ہیں، اضافت کی حالت میں اُن کے آخر میں ہمزہ لکھتے ہیں۔ یعنی ہمزہ یا

تو کسرۂ اضافت کا قائم مقام ہے یا پھر یائے وحدت کا۔ جیسے ع

آمد افسوس کناں مغبچۂ بادہ فروش

ہمزہ ماضی قریب واحد حاضر میں بھی ی کے بجائے ہوتا ہے۔ لیکن

عطف کے واؤ سے پہلے اضافت کا ہمزہ نہیں آتا۔ البتہ وحدت یا حاضر

(مخاطب) کا ہمزہ آتا ہے۔ جیسے ع

عجیب واقعہ وغریب حادثہ ایست

اور جیسے کوئی کہے "خوش آمدہ وصفا آوردہ"[2]

ان کے علاوہ شبہ اور جبہ کو دو ہ کے ساتھ لکھتے تھے (خطوطِ غالب

---

[1] اُردوئے معلیٰ ص ۳۷۳-۳۷۴۔ [2] رسالہ ہندوستانی جولائی ۱۹۳۶ء

ص ۴۴۳:

مہیش پرشاد نمبر ۹) اور یہی صحیح بھی ہے۔ خط نمبر ۱۳۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خرشید بغیر واؤ کے لکھتے تھے۔ البتہ صرف "خور" کو (غالباً التباس کے خوف سے) واؤ کے ساتھ لکھتے تھے۔ جنوں بریلوی کے خط میں پاؤں، گاؤں، چھاؤں وغیرہ میں نون غنہ پہلے اور واؤ بعد میں لکھا ہے۔ لیکن "گھنسیٹنا" کے بجائے "گھسیٹنا" صحیح کہا ہے۔ "ہاتھ" کو وہ "ہات" لکھتے تھے۔ اور "ہاتھی" کو "ہاتی"[1] لیکن خط نمبر ۱۴۶ (خطوط غالب) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "تڑپھنا" کے بجائے "تڑپنا" صحیح سمجھتے تھے۔ خط نمبر ۱۴۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاقو کو "چاک کردن" سے مشتق مان کر "چاکو" لکھتے تھے۔ حال آں کہ چاقو ترکی لفظ ہے۔

ان پابندیوں کے باوجود غالبؔ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ (۱) معروف و مجہول یے اور واؤ میں کوئی فرق نہیں رکھتے تھے۔ (۲) ہائے مخلوطی کے لیے دو چشمی ھ کی پابندی نہیں تھی۔ (۳) ترکی کی تقلید میں پیش کی حرکت واؤ سے ظاہر کرتے تھے۔ (۴) لکھیے سمجھیے وغیرہ پہ پہلے ہمزہ لکھتے تھے۔ لیکن بعد میں ہمزہ سے ایسی چڑ پیدا ہوئی کہ جہاں اس کی ضرورت تھی وہاں سے بھی علیحدہ کر دیا۔ مثلاً آجائے، لائے، لگ جائے گی آئے ہو، ہوئے وغیرہ افعال پر سے ہمزہ حذف کر دیا۔[2]

---

[1] رسالہ اردو ج ۸ ص ۳۲۸ کے سامنے والا عکس غالبؔ نے "بھوکا" اور "دودھوں" لکھا ہے۔ دیباچہ مکاتیب غالب ص ۲۲۹ [2] دیباچہ مکاتیب غالب ص ۲۲۸: (باقی صفحہ ۱۴۲)

ان بزرگوں کے بعد اور اب سے ۶۴ سال پہلے یعنی مئی ۱۹۰۵ء کے رسالہ فصیح الملک میں مولانا احسن مارہروی مرحوم نے املا پر بہت زور دیا۔ اور اُس زمانے تک جو اصول قائم ہو چکے تھے اُن پر بڑی پابندی کے ساتھ عمل شروع کیا۔ انھوں نے خصوصاً ان باتوں پر زور دیا۔

۱۔ ہی کو جب ضمیر کا آخری جزو بنایا جائے تو "وہ ہی" اور "یہ ہی" کے بجائے "وہی" اور "یہی" لکھا جائے۔ لیکن مولانا احسن نے تمھیں، انھیں اور ہمیں میں اشباعی الف نیچے لکھ کر تمہیں، انہیں اور ہمیں (بجائے تمی، انمی کے) لکھنا پسند کیا ہے۔ اسی طرح وہ "یوں ہی" کے بجائے "یونہیں" نثر و نظم دونوں میں لکھتے تھے۔[1]

۲۔ دیکھیے، دیجیے، اس لیے وغیرہ میں ے کے پہلے ہمزہ نہ لکھا جائے۔

۳۔ ہندی الاصل الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی نہ ہو، بلکہ الف ہو۔ جیسے پتّا، بھروسا، سامنا، دھوکا، کلیجا، مہینا، ٹھیکا وغیرہ۔ اسی طرح حلوا،[2] معمّا، تمغا، چلیپا، ناشتا وغیرہ میں خواہ مخواہ "ہ" نہ لکھی جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) غالب کی املا کی مزید خامیاں اسی دیباچہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

[1] غالباً صرف جلال لکھنوی نے "میں ہی" کے بجائے "میہیں" لکھا ہے:۔

جلایا کیجیے وہ شب وصل میں
میہیں رات بھر شمع محفل رہا

[2] کراچی کے حلوا فروش "حلوہ" لکھتے ہیں اُن کی تقلید پڑھے لکھے لوگ بھی کرنے لگے ہیں۔

۴۔ جب لفظ کے آخر میں ہ آئے، تو فاعلیت، مفعولیت اور اضافت حالت میں اسے یے سے لکھا جائے۔ جیسے "کسی زمانے میں" اسی طرح حالت عطیبی یعنی اضافت وعطف میں بھی عربی فارسی الفاظ اسی طرح لکھے جائیں اس طرح بولے جاتے ہیں۔ مثلاً لب ولہجے میں "مقدمے بازی میں" وغیرہ

۵۔ مولانا احسن اسی رسالہ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"یائے معروف ومجہول کا لحاظ تو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ مگر یائے ماقبل مفتوح کی کتابت کوئی خاص نہیں۔ اُس کے لیے نصف دائرہ مناسب ہے۔ جیسے مَے، شَے وغیرہ"

۶۔ نون کے متعلق لکھتے ہیں کہ :۔

"نون کا تلفظ اُردو میں دو طرح ہے۔ جو نون آخر لفظ میں ظاہر کرکے پڑھا جائے وہ نقطے دار ہوگا۔ جیسے جان، تان۔ اور جو اس طرح ظاہر نہ ہو اُس میں نقطہ نہ ہوگا جیسے یہاں، کہاں۔ درمیان لفظ میں اگر نون بالاظہار ہو تو اُس پر معمولاً صرف نقطہ ہوگا۔ جیسے تنکا۔ اور اگر باعلان نہ ہو تو اُس پر نقطہ کے بجائے یہ نشان (ں) الٹا جزم ہوگا۔ جیسے تانبا۔

اسی طرح ہائے مخلوط کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ :۔

"ہمارے نزدیک صرف وہی ہے جو ہجوں میں اپنے اول و آخر حروف سے ملے۔ جیسے بھی، بھان۔ اس کی کتابت دو چشمی ھ سے ہوگی، باقی ہر لفظ میں ایک ایک شوشے سے لکھی جائے گی۔ جیسے کہیں، جگہ، ہو وغیرہ۔"

۷۔ اسی رسالے میں مولانا لکھتے ہیں کہ

"جو الفاظ الگ لکھے جانے میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے اور جن کی ترکیب بھی جداگانہ ہے اکثر جدا جدا لکھے جائیں گے جیسے آئیں گے، ہوں گے، جس کی، آپس میں، غرض کہ بل کہ، کیوں کہ، علاحدہ، حال آں کہ، چناں چہ، چوں کہ، کون سی، اس واسطے کہ، دل چسپ، دل کش، ہم سر، کم یاب، دست یاب، خوب صورت وغیرہ۔

ان کے علاوہ مولانا احسن مارہروی مرحوم نے رسالہ فصیح الملک (اگست ۱۹۰۵ء) اور تاریخ نثر اردو (صفحہ ۳۵۶ - ۳۵۹) میں بہت سے الفاظ کی صحت پر زور دیا ہے۔ وہ "دائم المریض" بلکہ "دائم المرض"، "زدِ رواں" نہیں بلکہ "روحِ رواں" لکھتے تھے۔ اہل دہلی کی طرح ایجاد کو مذکر اور طرز کو مؤنث لکھتے تھے، اژدحام کو ازدحام۔ فی زمانہ کوئی زمانہ سینکڑوں کو سیکڑوں، جھوٹن کو جھوٹ، سونچ کو سوچ، پرواہ کو پروا

زوپیے کو "بوُلی" عش عش اور عبیر دونوں کو الف سے اور خود دونوں کو آخر نونِ غنہ سے لکھتے تھے۔ عربی تے پر صرف تنوین لکھنے پر زور دیتے تھے۔ مثلاً فطرةً، قدرةً، ضرورةً، دفعتہً، مقابلتہً، نسبتہً وغیرہ۔ لیکن یتیم کے ساتھ یسیر (بمعنی قلیل) اور وجیہ کے ساتھ شکیل (مترادف) کو غلط سمجھتے تھے۔ غالب کی طرح وہ بھی گزشتن، گزر وغیرہ کو زے سے لکھتے تھے، لوٹنا کی جگہ پلٹنا، ناراضگی کی بہ نسبت ناراضی اور جاکے، کھاکے وغیرہ کی جگہ جاکر کھاکر کو فصیح سمجھتے تھے۔

ان کے بعد فنِ املا کے امام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے بار بار اس کی اصلاح اور ترمیم پر زور دیا ہے۔ رسالہ "اردو" (اکتوبر سنہ ۲۳ء) رسالہ "ہندستانی" (جنوری سنہ ۱۵ء۔ جولائی سنہ ۳۸ء) وغیرہ میں وقتاً فوقتاً اپنے بلند پایہ مضامین لکھے ہیں۔ پھر یہی اصول اخبار "ہماری زبان" (یکم اگست سنہ ۴۱ء) اور رسالہ "اردو" (جنوری سنہ ۴۴ء) میں شایع ہوئے ہیں جو انجمن ترقی اردو نے اختیار کیے ہیں۔

خلاصہ شروع میں خطِ نسخ کا رواج زیادہ تھا، اسی لیے پشتو، سندھی اور پنجابی آج بھی نسخ میں لکھی جاتی ہیں۔ سنہ ۸۲۵ھ کی تصنیف کی ہوئی مثنوی کدم راو پدم راو (جس کا سالِ کتابت معلوم نہیں) نسخ میں ہے۔

۸۔ گیارھویں صدی ہجری کے اکثر مخطوطات نسخ میں ملتے ہیں۔ پھر سنہ ۱۱۱۱ھ کا لکھا ہوا وفات نامہ (حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) بھی پاکیزہ

نسخ میں ہے۔ اس کے بعد رحمت اللہ گجراتی کے رسالے بھی نسخ میں ملتے ہیں اور غالباً اسی صدی کے آخر کا ایک مخطوطہ خالِ وجودی بھی نسخ میں ہے۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

"اوّل چاهیی که بوجی که انسان کی جسم میں شمس و قمر کس کون کهتی هیں، بوجنا که جمنی (داہنے) سوراخ کون شمس کهتی هیں اور ڈابی (بائیں) سوراخ کون قمر کهتی هیں، جب حرارت غالب هووی، تب شمس کون بند کری، دوئی سین اور سردی غالب هووی تب قمر کون بند کری اور کبی همیشه دن کون شمس بند کری، اور رات کون قمر۔"

لیکن شمالی ہند اور دکن میں یہ مخطوطات دسویں اور گیارھویں صدی ہجری سے ضرور نستعلیق میں پائے جاتے ہیں۔[1]

گ[2] کے لیے نویں صدی ہجری میں کاف عربی کے نیچے تین نقطے لکھے جاتے تھے

---

[1] پروفیسر شیرانی مرحوم نے لکھا ہے (مقدمہ پنجاب میں اردو) کہ عالمگیر کے بعد شمالی ہند میں نستعلیق رائج ہوا۔ [2] شیرانی مرحوم نے لکھا ہے کہ بعد میں گاف کیلئے تین نقطے اوپر لگنے جانے لگے۔ (انتخاب میں اُردو مقدمہ)۔

سنہ ۱۰۹۶ھ کی لکھی ہوئی ایک بیاض میں گ کے لیے ایک مرکز ہے، اور اس پر ، کا ہندسہ ہے۔ سنہ ۱۱۰۴ھ کی لکھی ہوئی بیاض میں گ پر ایک مرکز ہے۔ اور کبھی کبھی ایک پیش بھی ہے۔ اسی بیاض میں ٹ پر چھوٹا "ط" بھی ملتا ہے اور کہیں کہیں اُس کے نیچے دو نقطے بھی ہیں۔[۱]

دسویں صدی ہجری کے ایک مخطوطے میں مشدّد حروف کو دوبار لکھا گیا ہے، اسی طرح الف ممدودہ کو دو الف کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔ اور الف مدّہ کے لیے زبر اور مد دونوں ہوتے تھے۔ گیارہویں صدی ہجری میں ٹ کے لیے ط کے علاوہ چار نقطے بھی ایک بیاض میں ملتے ہیں۔ اور ڈ کے لیے دال پر ایک زبر، اسی بیاض میں مخلوطی ھ اکثر نظر آتی ہے۔ اور جزم کو عموماً گول دائرے کی طرح لکھا ہے۔ لیکن جہاں ماقبل حرف مفتوح یا مجہول ہے تو وہاں الٹا جزم مثل ہلال کے ہے۔ اسی مخطوطے میں یائے معروف کے لیے حرف مکسور کے نیچے چھوٹا الف ملتا ہے، شیرانی مرحوم نے لکھا ہے کہ:۔

"ٹ، ڈ، ڑ پر پہلے تین تین نقاط بعد میں چار چار نقاط لگائے جانے لگے۔ اور گجرات میں بارہویں صدی ہجری کی ابتدا میں ان پر ضرب کی علامت × لگائی جاتی تھی۔"[۲]

---

[۱] سنہ ۱۱۰۴ھ میں تاریخ غریبی لکھی گئی اس میں ٹ کے اوپر چار نقطے ہیں۔ لیکن ڈ، ڑ کے نیچے تین نقطے ہیں۔ [۲] انتخاب میں اردو مقدمہ:

تین نقطوں والے ڑ کی مثال ہم کو بارہویں صدی ہجری کے ایک مخطوطے میں بھی ملی ہے، جو لوائح جامی کی شرح ہے۔ اور اسی صدی کے ترجمۂ گلستان میں ڑ پر چار نقطے ملتے ہیں۔ اسی صدی کے ایک مخطوطے میں ڈ کے لئے دال پر دو نقطے اور اس پر ڈیش ہے۔ یہی چیز ہم کو اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر کے نستعلیق ٹائپ میں ملتی ہے۔

اسی صدی میں رحمت اللہ گجراتی کے نسخوں میں کہیں کہیں یائے ساکن کے قبل اگر زبر ہے تو اس یا کو نصف دائرہ دیا گیا ہے۔ پھر اورنگ زیب کے فرمان کے بموجب وہ ہندی الفاظ جو فارسی کی تقلید میں مختفی ہ پر ختم کئے جاتے تھے، الف سے لکھے جانے لگے۔ اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں جب نستعلیق ٹائپ شروع ہوا تو بہت کچھ ترقی یافتہ املا کا رواج ہونے لگا۔ ان کے بعد انشا اور غالب وغیرہ نے جو اصلاحیں اور تجویزیں اس فن سے متعلق پیش کی تھیں وہ سب اوپر آچکی ہیں۔ اب ہمارے اساتذہ کا فرض ہے کہ زبان کی یکرنگی کو قائم رکھنے کے لیے اپنے اسلاف کی کوششوں پر نظر رکھتے ہوئے آسان اور بہتر اصول اختیار کریں تاکہ مبتدی بھی کوئی دقت محسوس نہ کرے۔

میرؔ کی مثنوی

"دریائے عشق"

کا ایک ماخذ[1]

میر تقی میرؔ کی مثنوی "دریائے عشق" کے ایک ماخذ کے متعلق اس مضمون میں تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ میرؔ کی یہ مثنوی بڑی دلچسپ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک "جوان خوش رعنا" سیر چمن سے واپس ہوتا ہے۔ رہ گذر میں کسی بالا خانے کی طرف اُس کی نگاہ اُٹھتی ہے اور وہ ایک "آفت تازہ" سے دو چار ہو کر تڑپنے لگتا ہے۔ جب اُس کے عشق کا چرچا پھیلتا ہے تو محبوبہ کے خاندان والے سخت برہم ہوتے ہیں۔ اور عاشق کے قتل کا ارادہ کرتے ہیں۔ لیکن :-

پھر یہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بدنام　　سن کے آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا　　کس نے مارا اسے کہاں مارا

[1] رسالہ "اردو" کراچی۔ اپریل ۱۹۵۱ء

اس لیئے یہ رائے قرار پائی کہ اسے دیوانہ مشہور کرکے ہر طرح ذلیل و خوار کیا جائے اور خوب زدوکوب بھی کیا جائے۔ چنانچہ یہ سب کچھ کیا گیا، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، آخر مجبور ہوکر:-

گھر میں جا بہرِ دفعِ رسوائی — بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
یاں سے یہ غیرتِ مہِ تاباں — جاکے چندے رہے کہیں پنہاں
شب محافے میں کرکے اس کو سوار — ساتھ دی ایک دایۂ غدار
پار دریا کے جلد رخصت کی — اس طرح فکر رفعِ تہمت کی
گھر تھا اک آشنا کا مدِ نگاہ — واں ہو روپوش تا یہ غیرتِ ماہ

لیکن جونہی اس محبوب کا محافہ گھر سے نکل کر روانہ ہوا، عاشق کو بھی خبر ہو گئی اور وہ ساتھ ہو لیا۔ بالآخر اُسے طاقت ضبط نہ رہی اور وہ ــــ ع : دل کے غم کو زبان پر لایا ــــ دایہ بڑی حیلہ ساز تھی۔ اُس نے عاشق کو تسلی دی اور کامیابی کی امید دلائی۔ اور اُسے محافے کے ساتھ کشتی میں سوار کرلیا۔ لیکن

بیچ دریا کے دایہ نے جاکر — کفش اُس گل کی اس کو دکھلاکر
پھینکی پانی کی سطح پر یک بار — اور بولی کہ او جگر افگار
حیف تیری نگار کی پاپوش — موجِ دریا سے ہوئے ہم آغوش
غیرتِ عشق ہے تو لا اُس کو — چھوڑ مت یوں برہنہ پا اُس کو

بہرحال کمند کے گرتے ہی وہ جوان دریا میں کود پڑا۔ لیکن وہ ایسا ڈوبا کہ پھر ابھر نہ سکا۔ دایہ کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن محبوبہ دل ہی دل میں سوگوار رہی۔ اور وہ اپنے عزیز کے یہاں مشکل سے ایک ہفتہ رہی تھی کہ اپنے گھر واپس چلنے کی آرزومند ہوئی۔ غرض روانگی ہوئی اور جب کشتی وسط دریا میں پہنچی تو اس سوگوار نے دایہ سے بڑے بھولے پن سے پوچھا:۔

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ   یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ؟
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش   تھا تلاطم سے کس طرف ہم دوش
تجھ کو آیا نظر کہاں آکر   پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جاکر
مجھ کو دیجو نشان اُس جا کا   میں بھی دیکھوں خروش دریا کا

جب دایہ نے اُس مقام کی نشان دہی کی تو محافہ نشین بلا تامل وہاں کود پڑی:۔

کششِ عشق آخر اُس مہ کو   لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو

بالآخر دریا میں جال ڈالے گئے اور ع:

نکلے باہر دلے ہوئے نکلے   دونوں دست و بغل ہوئے نکلے

میر نے قصہ یہیں ختم کر دیا ہے۔

میر کے بعد اُردو میں مصحفی نے اسی قصہ کو اپنی مثنوی "بحر المحبت" میں نظم کیا ہے جو مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تہذیب و ترتیب سے شائع ہو چکی ہے۔

مصحفی نے میر کے تقدم کا اعتراف کیا ہے :-

ع "میر صاحب نے پہلے نظم کیا"

لیکن خود میر کی مثنوی میں کسی جگہ اس قصے کے ماخذ کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا

میرے مکرم مولانا راشد برہان پوری کے یہاں ایک مخطوطہ دیکھنے میں آیا ہے، جس میں ایک فارسی مثنوی "قضا و قدر"[1] کسی غیر معلوم شاعر کی ہے، اس کا قصہ سوائے چند معمولی اختلافات کے بالکل وہی ہے جو میر تقی میر نے اپنی مذکورہ بالا مثنوی "دریائے عشق" میں نظم کیا ہے۔ "قضا و قدر" نام کی تین اور مثنویاں فارسی میں ملتی ہیں۔ ایک محمد قلی سلیم (المتوفی سنہ ۱۰۵۷ھ - سنہ ۱۶۴۷ء) کی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے :-

شنیدم روزے از خونابہ نوشے چو گل از پارۂ تن خرقہ پوشے

دوسری مثنوی اسی نام کی محمد افضل سرخوش کشمیری (م سنہ ۱۱۲۶ھ سنہ ۱۷۱۴ء) کی بھی ہے۔ ان کے علاوہ میر علی شیر قانع تتوی نے بھی اسی نام سے ایک مثنوی سنہ ۱۱۵۷ھ م سنہ ۱۷۱۴ء میں لکھی تھی۔ لیکن جس مثنوی کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے وہ ان سب سے مختلف ہے اور ایک ایسے شاعر کی ہے جس کے نام اور تخلص کا کہیں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ مثنوی کے آخر میں یہ عبارت ہے :-

[1] فارسی کے متعدد شعراء نے اس نام کی مثنویاں لکھی ہیں۔ ممکن ہے یہ مذکور الصدر مثنوی میر علی شیر قانع تتوی کی ہو جو کتابت کی بے اعتدالی کا شکار ہو گئی ہے

"تمت کلام بعون ملک علام۔ تحریر فی التاریخ

۲۷ ذی الحجہ سنہ ۱۱۱۳ھ در مقام حیدر آباد۔"

اس عبارت سے مثنوی کی کتابت کا سال سنہ ۱۱۱۳ھ معلوم ہوتا ہے اور یہ صحیح ہوگا۔ کیونکہ مخطوطے کے ایک دوسرے مقام پر سنہ ۱۱۰۸ھ لکھا ہوا ہے اور کاغذ بھی تقریباً ڈھائی سو سال کا پرانا معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ ظاہر ہے کہ یہ مثنوی سنہ ۱۱۱۳ھ سے قبل نہیں تو اس سال تک ضرور لکھی جا چکی تھی۔

یہ مثنوی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اورنگ زیب عالمگیر (المتوفی سنہ ۱۱۱۸ھ۔ سنہ ۱۷۰۶ء) کے عہد کے ناظم بنگالہ یعنی شائستہ خاں کے ایک قاصد کے متعلق ہے کہ وہ بنگال سے تحفے تحائف لے کر دربارِ شاہی کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں وہ ایک "پری پیکر" پر فریفتہ ہو گیا اور دنیا و مافیہا سے بے پرواہ ہو کر اُس کے در پہ فروکش ہو گیا۔ اُس کے مسلسل ایک ہفتہ فاقہ کرنے پر محبوبہ کے والدین کو "جیو ہتیا" کا خوف ہوا اور اُنھوں نے ملاقات کی راہ نکال دی۔

مثنوی میں شائستہ خاں کے متعلق اس طرح ہے:۔

امیرے بود بے مثل دیگانہ	بہ جود و لطف مشہور زمانہ
بُد و شائستہ اندر نکتہ دانی	کہ حق دادہ لقب شائستہ خانی
بہ بنگالہ مخاطب بودہ دایم	کہ دادہ ملک را در ضبط قایم

یوں تو شائستہ خاں بنگال کا ناظم دو مرتبہ رہ چکا ہے یعنی ایک مرتبہ

سنہ ۱۰۷۵ھ۔ سنہ ۱۶۶۴ء سے سنہ ۱۰۸۸ھ۔ سنہ ۱۶۷۷ء تک اور دوسری بار سنہ ۱۰۹۱ھ سنہ ۱۶۸۰ء سے سنہ ۱۱۰۰ھ۔ سنہ ۱۶۸۸ء تک۔ لیکن اِن اشعار سے واضح ہے کہ اُس کے (انتقال کے ؟) بعد یہ مثنوی لکھی گئی۔ اور "امیرے بود" سے یہی خیال ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ ماضی سے تعلق ہے۔ چناں چہ میرا خیال ہے کہ مخطوطے کی کتابت کا جو سال اوپر مذکور ہوا یعنی سنہ ۱۱۱۳ھ وہی اس مثنوی کے نظم کرنے کا سال بھی ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ مبالغوں کے علاوہ یہ قصہ محض قصہ نہ ہو، بلکہ واقعہ بھی ہو[1]۔ لیکن افسوس ہے کہ شاعر کے تخلص یا اُس کے نام کے متعلق کہیں کوئی اشارہ تک پایا نہیں گیا۔ اور اگر کہیں اس کے متعلق پتا بھی چل جائے تو اُس کی شاعری اپنے فن میں ایسی ہے کہ اُسے گمنام ہی رکھے گی۔ یعنی یہ شاعر فارسی اچھی خاصی جانتا ہے لیکن فن شاعری میں علم قوافی سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے۔ اُس سے بارہا قافیے کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ مثلاً:۔

کہ ہر کس بہر بگذشتن نشستہ ۔۔۔ یقینم شد کہ دست از جاں بشستہ
کند ہر کس درو عزم نشستن ۔۔۔ محالاتش بود از وے گذشتن
نہ پروائے بت و نے برہمن داشت ۔۔۔ کجا پروائے آں سنگین دلاں داشت

---

[1] ایسے بعض واقعات کو نظم کرنے کا نہ صرف دستور تھا، بلکہ بعض شہزادے ترغیب بھی دیتے تھے مثلاً شہزادہ دانیال نے محمد رضا نوعی خبوشانی (م سنہ ۱۰۱۹ھ) سے مثنوی "سوز و گداز" نظم کرائی تھی۔ جو اکبرنامہ جلد اوّل کے آخر میں لکھنؤ سے سنہ ۱۲۸۴ھ میں شایع ہو چکی ہے۔

ز مالش ہر چہ گویم بیشتر بود　　زالماس و جواہر بے عدد بود

ز ہر بت پرستی شوخ و سرمست　　رواں شد زاں کہ رسم ہندواں ست

لیکن کاتب کی بے شمار غلطیوں کے پیشِ نظر، قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ شاعر سے واقعی یہ غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ بہر حال کسی وجہ سے میر تقی میر نے اپنی مثنوی "دریائے عشق" میں کہیں اس کا حوالہ نہیں دیا۔ اور گو کہ نفسِ قصہ میر کے یہاں بھی وہی ہے جو اس فارسی مثنوی میں ہے۔ لیکن ان دونوں کے اشعار میں کسی جگہہ کوئی مطابقت نظر نہیں آتی۔ بلکہ میر سے اسکی توقع رکھنا بھی سوئے ظن کے مترادف ہے۔ میر کی مثنوی میں تقریباً پونے تین سو اشعار ہیں۔ اور مثنوی "قضا و قدر" کے اشعار کی تعداد بھی قریب قریب اتنی ہی ہے۔ لیکن میر نے عشق کے واردات پر اپنا زور صرف کیا ہے اور دایہ کے قصہ کا اضافہ کیا ہے۔ اس کے برعکس فارسی مثنوی میں محبوبہ کے سراپا کے متعلق بہت سے اشعار ہیں۔ اور فارسی شعرا کی طرح اسی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ شروع میں پندرہ شعر حمد میں اور تیرہ نعت میں ہیں۔ لیکن میر نے اپنی اور عشقیہ مثنویوں کی طرح اس مثنوی میں بھی ابتدائی بتیس[۳۲] اشعار عشق کی تشریح اور اُس کی کارگزاریوں سے متعلق

ک سید محمد والہ (المتوفی سنہ ۱۱۸۲ھ) نے بھی اسی سے ملتا جلتا قصہ "موہنی و طالب" مثنوی میں لکھا تھا۔ یہ قلمی نسخہ مولوی عبدالحق صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مولوی نصیرالدین ہاشمی نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" (صفحہ ۴۲۷) میں اس کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

لکھے ہیں اور قصہ کو اس طرح شروع کیا ہے :-

ایک تھا اک جوان رعنا تھا　　لالہ رخسار و سروِ بالا تھا

فارسی مثنوی جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ادبیت کی زیادہ حامل نہیں ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شاعر کا مطالعہ اچھا خاصا تھا۔ اُس نے بحر سریع مسدس مطوی موقوف میں پندرہ شعر حمد میں لکھے ہیں۔ یعنی وہی بحر جو نظامی گنجوی نے مثنوی "مخزن الاسرار" کے لیے استعمال کی تھی :-

ہست کلیدِ درِ گنجِ حکیم　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کی تقلید میں متعدد شعراء نے مثنویاں لکھی ہیں۔ لیکن اس مثنوی کے مصنف نے اس بحر میں جو پندرہ شعر لکھے ہیں اُن سے اُس کی اعلیٰ قابلیت نہ بھی اُس کی اوسط درجہ کی علمی استعداد کا ضرور پتا چلتا ہے۔ پھر وہ کئی مقامات پر جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، مثنوی کی بحر تبدیل کرتا ہے۔ یہ بذاتِ خود دلیل ہے اس بات کی کہ وہ شعر گوئی میں قدرت رکھتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ نومشقی کی وجہ سے وہ علم قوافی سے بیگانہ تھا۔ اس کی مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے :-

ہست ترا قدرت و صانع توئی　　کارگذارندہ و مانع توئی

باعثِ پیدائشِ عالم ز لست　　بے حکمت ایچ گیاہے نہ رست

لالہ و گل را نبود جز تو رنگ　　کے دہد آتش ز دلِ خویش سنگ

حکمتِ عالم ہمہ از فضلِ تست | قدرتِ آدم ہمہ از فضل تست
مرغ سرایندۂ توحید تست | نغمہ نوازندۂ تحمید تست
روز نمایاں شدہ از نور تست | شمع گدازاں شدہ از سوز تست
زیب دہ چہرۂ خوباں توئی | عیب پذیرِ ہمہ زشتاں توئی
چہرہ ز خوانت ہمہ خلقاں بزد | ابر ز جودت بہ صدف دُر دہد
میوۂ الواں دہی از چوبِ خشک | برگ گلے را تو دہی بوئے مشک
قدرتِ اجرا دہی آب را | رمز نہادی تو نبسر خاب را
طرح دہ ارہ بہ پشتِ نہنگ | تیز کنِ نشترِ نیشِ پلنگ

نرگسِ خوباں شدہ بیمار تست | چہرۂ گلہا شدہ زیبا ز تست
جملہ جہاں، ہیچ، توئی ہست.... | .....تو باشد ہمہ بالا و پست

اِن اشعار کے بعد نعت کے اشعار ہیں اور وہ بحر ہزج مُسدّس محذوف میں ہیں:-

رسول اللہ گُلِ گلزارِ قدرت | نمایاں گشتہ در باغِ نبوت
بہ امرِ حق قدم را کرد قایم | براہ راستی بر پاست دایم
دُرِ شالیستۂ بحرِ رسالت | ....
گرامی صفحۂ ذات ستودہ | ز غیرت مہر بر پشتش نمودہ

به انگشتش کلیدِ گنج امکاں ‌‌ ‌ خجل بُد از کفش هم بحر و هم کاں

بود ماهِ نو از حلقه بگوشاں ‌ ‌ فلک در خدمتش استد خموشاں

به یک دم می کند طی سموات ‌ ‌ ملایک را دهد درس کمالات

خدا از بهر آں ادرا سرشته ‌ ‌ که خواند حرف هائے نا نوشته

اسی طرح پانچ شعر اور لغت میں ہیں۔ پھر اصل حکایت اسی بحر میں اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

حکایت کرد مردے از گذشته ‌ ‌ که در عهدِ شهنشاه خجسته

محی الدیں محمد نام شاہے ‌ ‌ به ملک هند شاه دین پناهے

زعدلش داد .... ایام ‌ ‌ بعهدش شیر و بز با هم شده رام

چناں آزار و فتنه از جهاں رفت ‌ ‌ که ملکش را تواں دار الاماں گفت

اس کے بعد ہی دو شعر بحر متقارب مثمن مقصور میں ہیں:۔

چنانش حیا گشته با او قریں ‌ ‌ که گوید ملک احسن و آفریں

شجاعت شهامت غلامانِ او ‌ ‌ اجل هم گریزد ز میدانِ او

اور پھر وہی بحر دوبارہ شروع ہو جاتی ہے اور آخر تک قائم رہتی ہے:۔

به هر کشور بعزمِ رزم آید ‌ ‌ اماں گویاں قضا از جا در آید

غرض در لشکر او خلق جهان ست ‌ ‌ خدا یارش که نادر در زمان ست

امیرے بود بے مثل و یگانہ	بجود و لطف مشہورِ زمانہ
بُداد شائستہ اندر نکتہ دانی	کہ حق دادہ لقب شائستہ خانی
بہ بنگالہ مخاطب بود دایم	کہ دادہ ملک را در ضبط قایم
ز مالش ہرچہ گویم بیشتر بود	ز الماس و جواہر بے عدد[لہ] بود
ز فیل و اسپ و اشتر بے شمارش	ہزار ..... وصد قطارش
بہ قسم تحفہ بہرِ آں شہنشاہ	جدا کرد از متاعش جنسِ دلخواہ
ز فیل و اسپ تازی چند در چند	مہیا کرد بہرِ آں خداوند
دگر از جنس عود و عنبر و مشک	گلاب و عطر دیگر صندل خشک
ز جنسِ مخمل و سنجاب و قاقم	زرِ نقد و ز اموالِ تنعم
غلامان و کنیزانِ عجائب	ز شیر و گردنِ قسمِ غرائب
ز باز و چرغ و یوز و ہم ز شاہیں	دگر صوف و سقرلاط و زقالیں
تفحص کرد اندر خادمانش	جوانے را کہ دادند کار دانش
پسندیدہ بر آورد از میانہ	کہ گرم و سرد دیدہ از زمانہ
بیر ایں تحفہ را نزد شہنشاہ	رساں از من سلام و عذر در خواہ
رواں شد سوے منزل گاہ...	....
قضا را شہرے اندر راہ آمد	ہمہ خلقش بتماشا ....

لہ یہاں بھی قافیے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی

زن و مردش صف اندر صف کشیدہ | کہ گوئی سور شاں در سر رسیدہ
زیک سو خیل رعنایاں ستادہ | بسوئے عاشقاں در خوں فتادہ
گل اندام و سہی سرداں نازک | بمثل آہوانِ شوخ و چابک
یکے بہتر زیک آنجا ہر آداں | ہمہ شیریں بتان خوش نگاہاں
ولیکن بود ماہے درمیانہ | کہ ہمتائیش نبودہ در زمانہ
پری پیکر ولیکن آدمی زاد | چو نقش نازنین خوب استاد

پھر بارہ اشعار اس "پری پیکر" کے سراپا کے متعلق ہیں۔ اس کے بعد "تحفے" لے جانے والے جوان کی شیفتگی کا حال شروع ہو جاتا ہے۔

جوانِ خستہ، دل از دست دادہ | میان خاک و خوں اندر فتادہ
فدا کردہ بہ او ہم مال و جانش | کہ وا دروا بدہ دردِ زبانش
رواں دنبال شوخ نازنیں شد | کہ فارغ ہم زکفر و ہم زدیں شد
بمثلِ سایہ دنبالش ہمی رفت | منم مجنوں تو ئی لیلیٰ ہمی گفت
رواں دلبر سوئے آرام گہ شد | زخوباں انجمے در کف مہ شد
قضارا آمد اندر موضع خویش | رواں اندر پیش دل دادہ درویش
چو رفت آں شوخ اندر مسکن خود | سر دروازہ اش استادہ بیخود
چناں در بحر حیرت غرق گشتہ | کہ یک دار دبہ آب اندر نوشتہ
خلایق در تعجب ماند ازیں حال | کہ ایں را چیست مطلب ازیں قال

خبر از حالتش در عام افتاد | چو طشتِ حرمتش از بام افتاد
پدر مادر بمنع آں پری رو | کہ از خانہ بروں......
جواں در انتظار دیدن او | نظر از خلق ببریدہ بجز او
نہ آرامش نہ خوابیدن نہ خوردن | بجز دیدار ممکن ہست مردن
قضارا ہفتہ از خوردن افتاد | کہ شورے درمیانِ قومش افتاد
چو ایں قصہ بہ عالم گشت مشہور | کہ ایں گم کردہ رہ را چیست منظور
ز خواب و خور فتادہ او بیک سو | بخالق کس چہ ساق ہنایدش رو
میانِ ہنداں ایں رسم نبود | کہ شخصے بر در اندر فاقہ میرد
پدر با مادرِ آں شوخ دلبر | دمے در فکر گشتے ہر دو ہم سر
بلا از غیب بر ما گشت نازل | کہ گشت عمر شد فارغ ز حاصل
کہ ایں گمرہ نمی جنبد ازیں جا | ورا بودن چہ بدنامی ست ایں جا

لڑکی کے والدین آخر اس شیفتہ کی دلجوئی کے لیے جاتے ہیں اور جب اُس لڑکے یک ہفتہ فاقے کا سبب پوچھتے ہیں تو :-

زباں بکشاد آں سرگشتہ بے باک | اگر یارم خوراند نبو دم باک
دگرنہ من بخواہم خورد خود چیز | کہ تا جانم بر آید زیں قفس نیز

اس لیے وہ دونوں مجبوراً :-

رواں رفتند آں ہر دو ازاں جا | بہ پیشِ آں صنم گفتند پیدا :-

کہ اے نا سودۂ ناشاد گمنام ۔ ترا ناکامی آمد پیش از ایام

ترا نا بالغ ازیں رہ گشتہ بودیم ۔ حنا از دست شد از بسکہ سودیم

کہ فردا نسبتت با کے تواں کرد ۔ چنیں سرے نہاں تا کے تواں کرد

ترا ما نام زد کردیم ازیں پیش ۔ قبولیت شدہ در قوم و در خویش

ماں باپ کے لعن وطعن پر لڑکی کو کہنا پڑا :-

اگر عقلِ دلیش گردید زائل ۔ دلِ من خود بہ او ہم نیست مائل

چناں چہ جب ماں باپ کو اُس کی عصمت پر یقین آیا تو اپنی زبان کو طعن و تشنیع سے روکا :-

پدر مادر شنیدہ زو سخنہا ۔ فرو بستند از طعنش زبانہا

بدو گفتند گر مطلب نہ داری ۔ برائے مصلحت کارے گذاری

گر اورا دہ بخوردن تو طعامے ۔ دگر بشنو از و حرف و کلامے

کہ اورا چیست مطلب زیں خرابی ۔ چہ باعث گشتہ اورا اضطرابی

آخر کار وہ لڑکی اُس شیفتہ کے پاس گئی اور اپنے ہاتھ سے اُسے کھانا کھلایا :-

بدستش در دہاں چوں لقمہ می کرد ۔ تو گوئی مردہ را زندہ می کرد

لیکن :-

پس از لختے رواں شد سوئے خانہ ۔ کہ می رفت و ہمی خواند ایں ترانہ

[illegible]

نہ دانم چوں زید ایں کشتۂ من — کہ برق آفتش سوزید خرمن

دلش رحمے بہ حال خستہ آورد — کہ حق در مرکز خود جائے آورد[1]

محبوبہ کا دل پسیج گیا۔ لیکن شیفتہ اس عارضی ملاقات کے بعد اور بھی تڑپنے لگا:۔

شنو از حال آں سرگشتۂ دہر — محیط اضطرابِ موجۂ بحر

چو آں مہ گشت از نزدش مفارق — بغیر او شدہ از زندگی دق

اور اب تو یہ ہوا کہ:۔

صنم ہم شد بقصدِ چارۂ او — زدل سرگشتۂ و آوارۂ او

گذشت آں روز آمد روز دیگر — کہ آمد بہر تیمارش مکرر

آخرکار محبوبہ کے والدین نے مشورہ کیا:۔

چو روزے چند زیں سالش گذشتہ — پدر با مادرش ہم سرنشستہ

چہ باشد مطلب ایں خستہ جانے — تو بر من گو سخن را ارچہ دانی

دریں مدت چہ دیدی زیں دو تن تو — زبگذشتہ سخنہا را بمن گو

جوابش داد آں فرزانہ عورت[2] — ترا چوں می رسد فکرے بہ عورت

---

[1] اس کا قافیہ بھی ملاحظہ ہو۔ [2] لفظ عورت کا استعمال زن اور بیوی کے لیے ہمارے ملک والوں نے شروع کیا تھا۔ سیر الاولیا جو حضرت نظام الدین اولیاؒ اور اُن کے خلفاء و معاصرین کے متعلق ہے ۷۸۹ھ میں سید محمد بن سید مبارک کرمانی نے مرتب کی تھی۔ اُسی میں غالباً سب سے پہلے (باقی صفحہ ۱۶۴)

کہ ایں را مقصد ظاہر نہ باشد بغیر از دیدنش کارے نہ باشد

باپ کو ان دونوں کے پاک طینت ہونے کا یقین ہوا :-

پدر ناہم ز عشقش صدق آمد براہ غزنش در پیش آمد

اجازت داد با دختش کہ بے باک تو خدمت کن درا چوں ہست و پاک

پھر وہ محبوبہ اُس شیفتہ کے پاس آنے جانے لگی۔ لیکن یہ بات "فلکِ کج رفتار" کو کیونکر اور کب تک پسند آتی ؟ چنانچہ واقعہ پیش آیا کہ لڑکی کسی جگہہ تیرتھ کے لیے آمادہ ہوئی :-

ز راہ بت پرستی شوخ سرمست رواں شد زاں کہ رسم ہندواں ہست

ز خیل و فوجِ مہرویاں پس و پیش گرفتہ درمیاں از قوم واز خویش

ان "مہرویاں" کے حسن وجمال اور زیب و زینت کے متعلق سات شعر ہیں پھر لکھا ہے کہ :-

قضا را بود دریائے سر راہ کہ آبش تیرہ بودے چوں تہ چاہ

ز تعبر او خبر کس را نبا شد بہ گردابش اجل سرگشتہ باشد

سراسر آب او چوں اشکِ عشاق نگہ کردن بر دے او بود شاق

اس دریا کو عبور کرنے کے لیے ایک کشتی حاضر کی گئی اور وہ سب کو لے کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۳) اس لفظ کے یہ معنی لیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ نومبر ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۹، ۲۰۔

(ن میں وہ جوان بھی شامل ہو گیا) روانہ ہوئی۔

چو ماہ چاردہ در حد خوبی — رواں آمد بہ پائے اسپ چوبی

بروں آورد آں مہ کفش از پا — بہ سرعت شد کہ تا خود را کند جا

بہ دنبالش ہماں فرہاد پیشہ — پے ..... شدے آں شیر بیشہ

.... — ....

بہ ناگہہ کفش مہ افتادش از دست — بہ سرعت از پے آں کفش بر جست

بہ آب اندر برفت و بر نیامد — غریوے در میانِ خلق آمد

کہ بر آید سہال زندگانیش — خدا بخشاد عمرِ جاودانیش

عجب شورے میانِ مردم افتاد — جواں گم گشتہ خود را داد بر باد

صنم را دحشتے رو داد ازیں حال — بہ پردہ مژدہ می جست ازیں فال

دلش بگرفت خود از بت پرستی — کہ ماند یادگارے بہر ہستی

چو کشتی ز آب طوفاں .... رست — اسیرِ خویشتن را دم بدم جُست

فرود آمد صنم با خیل خویشاں — ولیکن دیدہ گریاں سینہ ریشاں

بمنعش مردمے از قوم وار خویش — کہ رفت از تو ملامت دل مکن ریش

ہمہ جمعے برائے چارۂ او — ز دل سر گشتہ و آوارۂ او

بہ افسون و فسانہ آں صنم را — بیادش دادہ تسکین لاؤ نعم را

ز بہرِ چارۂ دردِ دلِ خود — بخود در فکر دردِ بو العجب بد

دلیکن بستہ لب از راہِ فطرت	کہ گوید با کسے حرفے بقدرت

اس کے بعد وہ سوگوار تیرتھ کو جاتی ہے۔ لیکن جی نہیں لگتا تو واپس ہوتی ہے اور اسی طرح کشتی میں سوار ہوتی ہے :۔

بہ ناکامی گذشتش ساعتے چند	کہ برگشتہ از انجا شوخ پرفن
روانہ قومِ خویش او درمیانہ	دلے تیرِ قضا را بُد نشانہ
بہ آں دریار سیدے بار دیگر	ازیں تا زندگی مرگ ست بہتر
بہ کشتی آمد و بنشست دلبر	بہ سوئے خواہر و ہم سوئے مادر

لیکن جونہی کشتی اُس جگہ پہنچتی ہے جہاں وہ دیوانہ غرق ہوا تھا، تو لڑکی بھی چھلانگ مارتی ہے :۔

چو کشتی در دمے آنجا بیامد	کہ آں دیوانہ .... بیامد
گرفتش جزبہ آنجا پائے تا فرق	"رسیدم" گفت اینک مرا بشد غرق
فغاں از خیلِ رعنایاں برآمد	کہ دیگ عشق ایں جا بر سر آمد

پھر تو کہرام مچ گیا۔ اور غم و حسرت کے ملے ہوئے جذبات کارفرما ہوئے۔ غواص بلوائے گئے۔ اور :۔

یکے غواص کہنہ سال خوردہ	رسن با خویشتن در آب بردہ

اور وہ کہنہ مشق غواص جب کامیابی کے ساتھ سطح آب سے اوپر اُبھرا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ عاشق بھی اپنی محبوبہ کے ساتھ جال میں آ گیا

بیک دستش دو کفش اندر ہم بود — بدستِ دیگرش دبیرہ صنم بود

وجودِ ہر دو گشتہ آنچناں یک — کہ در گفتن ندارد ایں سخن شک

تعجب در خلائق گشت پیدا — کہ عشقِ پاک از ہیما شد ہویدا

ولے مادر پدر گفتند باہم — کہ ایں ہا را جدا سازیم از ہم

تجویز یہ ہوئی کہ ان دونوں کو جدا کرنے کے بعد آگ میں جلا دیا جائے :-

کہ ہر دو را بہ آتش در فروزیم — بعود و عنبر و صندل بسوزیم

کہ رسمِ ہندواں آریم برپا — بقسمِ خویش برداریم از جا

لیکن مسلمانوں کو خبر ہو گئی :-

خبر چوں گشت اندر اہلِ اسلام — کہ تدبیرِ چنیں کردند ایں خام

ہمہ در گفت گو گشتند ہر دو — کہ ما در خاک بگذاریم زیں رو

میانِ ہر دو فرقہ گشت شورش — چو منعش می کنند از راہِ سوزش

خبر با حاکمانِ شہر بردند — میانِ کینہ باہم ہر دو بستند

رسیدہ چوں سرانِ ہر دو کشتہ — کہ تیرِ عشق شاں از جاں گذشتہ

ز راہِ چارہ شاں بیچارہ کردند — فرو در قبر و خاکِ تیرہ کردند

ندامت خوردہ برگشتند آں قوم — ولے در شب کہ مردم گشتہ در نوم

بروں کردند از گل ہر دو تن را — بریدندے ز ہم آں مرد و زن را

روان شد خوں لبسانِ آب درجو فرو لبستند دست ...... تن او

دگر بارہ بجا ... در ... سپردند بعقیم اولیں در قبر کردند

بہ مسند گاہ اصلی ہر دو خفتند کہ تا روزِ قیامت ہر دو جفتند

گمانِ عاشقی امر محال ست بجز آں را کجا آں جا مجال ست

اس کے بعد جو اشعار ہیں اُن میں تو شاعری کے فن کی ٹانگ توڑ دی ہے :۔

چو ہر کامے کہ لذت یافت از عشق کجا پروا کند از سوزش درد

خداوندا العشقم راہ بردہ بہ آہ و نالہ صبحم را لبسر دہ

نے از بہر آں در دیدہ ام کن از آں تخم آتشِ جو صحم فسردہ کن

زقیدِ ہست و بودم دہ خلاصی زبانم را بہ بند از ناسپاسی

غرض کہ اسی طرح کے چند دعائیہ اشعار کے بعد بغیر کسی ربط کے پھر ایک دوسری بحر (متقارب مثمن مقصور) شروع کر دی جاتی ہے اور شاعر یا کاتب سے جو کچھ بن پڑتا ہے اس طرح لکھ دیتا ہے :۔

بہ ایشاں بہ بخشیم ز راہ عطا زعصیان بیہودہ دارم خطا

اسی طرح کے غلط سلط اور بے ربط تین شعر اور ہیں اور مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد خاتمے کی وہی عبارت ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

عبدالحی تاباںؔ پر ایک نظر[1]

شعراے متقدمین میں عبدالحی تاباںؔ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اسی لیے انجمن ترقیِ اُردو نے اُن کا دیوان ۱۹۳۵ء میں شایع کیا تھا۔ لیکن شاید کسی مصروفیت کی وجہ سے مولوی عبدالحق صاحب اُس کے مقدمے کے لیے زیادہ وقت نہ نکال سکے تھے۔ تاہم انھوں نے تاباںؔ کے حسن و جمال اور مے نوشی کے ذکر کے بعد اُن کے اُستاد کے متعلق مصحفیؔ کے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ "اگرچہ زبانی شاہ حاتم در ابتدا شاگرد حاتمؔ است۔ اما آنچہ شہرت دارد و واقعی ست اینست کہ بہ شاگردی محمد علی حشمت کہ شاگرد محمد غنی بیگ قبولؔ کشمیری ست بسیار بسر بردہ"۔ اس کے بعد مولوی صاحب موصوف نے تاباںؔ کی مثنوی کے یہ اشعار نقل کر کے حشمتؔ کی استادی کو تسلیم کیا ہے:-

---

[1] رسالہ اردو کراچی۔ بابت اپریل ۱۹۵۲ء

نہ استاد کی مجھکو تابِ تنا ۔۔۔ کہوں گر تو کب ایسی فکر رسا
کمالوں میں جن کے نہیں کچھ قصور ۔۔۔ وے سب طفلِ مکتب ہیں ان کے حضور
کسی کو کہاں اُس سے ہے برتری ۔۔۔ کہ ہے نام اُس کا محمد علی
تخلص بھی حشمت ہے ان کا بجا ۔۔۔ وہ اہلِ سخن بیچ ہے بادشا

لیکن تاباں کے حالات اور حشمتؔ کی استادی کا زمانہ وغیرہ متعین نہیں کیا گیا۔ اسی طرح تاباں کی جن غزلوں میں استاد کا نام آیا ہے وہاں نسخوں کے اختلاف کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں کیا گیا کہ فلاں مقام پہ حاتم چاہیے، اور فلاں جگہ حشمتؔ۔ چناں چہ اس مضمون میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ حاتم اور حشمتؔ کی استادی کا زمانہ متعین کیا جائے تاکہ اس طرح غزلوں کا بھی کسی قدر تعین ہو جائے کہ کس استاد کی تقلید میں کون سی غزل لکھی گئی تھی۔ اس لیے تاریخی ترتیب سے پہلے حاتم کی وہ زمینیں پیش کی جاتی ہیں جن میں تاباں نے اپنی غزلیں مرتب کی تھیں۔

حاتم اور تاباں حاتم نے "دیوان زادہ" میں نشان دہی کی ہے کہ سنہ ۱۱۳۵ھ[۱] میں اُنھوں نے ناجی کی زمین میں جو غزل لکھی تھی اُس کا پہلا مصرع یہ ہے:۔

ع گلشن اُس گل بن مری نظر دل میں ویراں ہو گیا

یہ غزل اہم ہے اس لیے اس کے کچھ اشعار نقل کیے جاتے ہیں:۔

[۱] بحوالہ سرگذشت حاتم از ڈاکٹر زور صفحہ ۷ - ۱۱۰

(الف) گلشن اُس گل بن مری نظروں میں ویراں ہوگیا
جھاڑ جھاڑ اور بوٹا بوٹا دشمنِ جاں ہوگیا
ایک بے پائی نہ اب تک نبض کی رفتارِ حیات
درد میرا تختۂ مشقِ طبیباں ہوگیا
اشکِ خوں آلودہ میرے اس قدر جاری ہیں آج
جا بجا لعلوں سے ہم بدخشاں ہوگیا
شور دریا تک ملاحت کا تری پہنچا ہے شور
بے نمک آگے ترے لب کے نمکداں ہوگیا
فیض صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں
طفلِ مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہوگیا[1]

اِس غزل کے مقطع میں حاتم نے لکھا ہے کہ اُن کے فیض صحبت سے عبدالحی تاباں اُس وقت تک یعنی ۱۱۳۵ھ تک "طفلِ مکتب"[2] نہ رہے تھے، بلکہ

[1] حسرت کے شایع کردہ انتخاب میں اس غزل کے دو شعر بھی ہیں۔ ہم نے لطف کے تذکرۂ گلشنِ ہند (صفحہ ۱۰۲۔ لاہور ۱۹۰۶ء) میں سے متن والے اشعار نقل کیے ہیں۔

[2] سرگذشت حاتم (صفحہ ۷۴) میں ڈاکٹر زور نے "طفلِ مکتب" سے یہ مطلب سمجھا ہے کہ مکتب کا طفل، عمر میں بھی طفل تھا۔ اور اُس وقت یعنی ۱۱۳۵ھ میں تاباں کی عمر ۱۵ سال سے بھی کم رہی ہوگی۔

اچھا لکھ کر اچھی خاصی شہرت کے مالک ہو گئے تھے۔ گویا اس بن سے پہلے ہی تاباںؔ کا تعلق حاتمؔ سے ہو چکا ہو گا۔ تاباںؔ نے اس زمین میں جو غزل کہی تھی وہ یہ ہے:-

کون سا عاشق ترے کوچے میں گریاں ہو گیا
اشک خونیں سے بتا کس کے گلستاں ہو گیا

کیوں کیا میں نے گریباں چاک اس کے غم میں ہائے
داغ سینے کا مرے سب میں نمایاں ہو گیا

کیا بُری ساعت تھی جو صیاد آیا باغ میں
ایک دم میں آشیاں بلبل کا ویراں ہو گیا

جب ہوئی معلوم میرے تئیں حقیقت عشق کی
جیونا مرنا مرے نزدیک یکساں ہو گیا

کس ہوس سے بلبلیں جاتی تھیں گلشن کو چلی
راہ میں صیاد اُن کا دشمن جاں ہو گیا *

* بات کہتے بے ستوں میں کوہکن نے جی دیا
کام تو مشکل تھا لیکن اُس کو آساں ہو گیا

صبح کو آیا ہمارے برمیں وہ خورشید رو
خانۂ دل دیکھ اُس کے مونہہ کو تاباں ہو گیا

اس غزل سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاباںؔ اُس وقت تک پختہ مشق شاعر ہو چکے تھے۔ خصوصاً تیسرا اور چھٹا شعر کوئی نومشق شاعر مشکل سے کہہ سکتا ہے۔
سنہ ۱۱۳۵ھ کے بعد مختلف سنین میں حاتمؔ کے یہاں ہم کو ایسی زمینیں نظر آتی ہیں،

جن میں تاباںؔ نے بھی غزلیں لکھیں ہیں۔ اور یہ تعلق مسلسل ۱۱۵۸ھ تک ثابت ہوتا ہے۔

مثلاً ۱۱۳۶ھ میں حاتمؔ کی ایک غزل تھی :۔

(ب) کابلوں کا یہ سخن مدت سے مجھ کو یاد ہے
یعنی بے معشوق جینا زندگی برباد ہے

اس غزل پر تاباںؔ نے یہ غزل لکھی تھی :۔

فصلِ گُل آتی ہے لیکن باغ میں صیاد ہے
بلبلوں کے حق میں یارو سخت یہ بیداد ہے

(ج) حضرت مظہر جان جاناںؒ (م ۱۱۹۵ھ) کی ایک مشہور غزل تھی :۔

چلی اب گُل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں آشیاں اپنا

اس غزل پر ۱۱۴۰ھ[1] میں حاتمؔ نے یہ غزل لکھی تھی :۔

---

[1] دیوان زادہ بحوالہ سرگذشت حاتم صفحہ ۱۱۱۔ لیکن اس میں حاتمؔ کا پہلا مصرع یہ ہے :۔

کیا جب فاختہ نے سرو اوپر آشیاں اپنا

ہم نے اوپر حسرت موہانی کے انتخاب میں سے وہ مطلع درج کیا ہے جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ غزل ۱۱۴۰ھ کی ہے۔ اگر یہ سنہ صحیح ہے تو پھر تاباںؔ کا تعلق حاتمؔ سے اس سنہ کے قریب ہوا ہوگا۔ یا حضرت مظہرؒ کے مرید ہونے کی وجہ سے یہ زمین اختیار کی ہوگی۔ میر محمد باقر حزیںؔ نے اور صابر بلگرامی نے بھی مرزا مظہرؒ کی یہ زمین اختیار کی تھی۔ دیکھیں گلشن ہند صفحہ ۲۰۵-۱۶۹

چمن میں کیوں نہ باندھے عندلیب اب آشیاں اپنا

کہ جانے ہے گل اپنا، باغ اپنا، باغباں اپنا

اور تاباںؔ نے جو غزل لکھی تھی اُس کا مطلع یہ ہے:-

نہیں کوئی دوست اپنا، یار اپنا، مہرباں اپنا

سناؤں کس کو غم اپنا، الم اپنا، فغاں اپنا

(د) میر محمد باقر حزیںؔ نے جو حضرت مظہرؔ کے شاگرد تھے ایک غزل لکھی تھی۔[1]

فصل گل آخر ہوئی کیا دیکھ ہوں گے شاد ہم

کچھ کرا اے صیاد اب ہوں گے نہیں آزاد ہم

اس غزل پر سنہ ۱۱۵۰ھ میں حاتمؔ نے یہ غزل لکھی تھی جیسا کہ دیوان زادے میں ہے۔[2]

---

[1] حزیں کا یہ مطلع گلشن ہند (صفحہ ۱۰۵) میں ملتا ہے۔

[2] سرگذشت حاتم، صفحہ ۱۱۲۔ لیکن اس میں حاتم کا صرف پہلا مصرع ہے اور وہ اس طرح ہے۔ ع کس کنے لے جائیں تیرے ظلم کی فریاد ہم۔

اسی زمین میں نواب امیر خاں انجام کی غزل ہے جس کا مقطع عین اُن کے خاتمے کے مطابق ہے کہ خنجر کے ایک ہی وار نے اُنھیں ختم کر دیا تھا۔ دیکھیں تذکرۂ گلشن ہند (صفحہ ۱۴) انجام کا مقطع یہ تھا:-

ساتھ اپنے سر کے تھا انجامؔ پاسِ تمکنت

شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ فولاد ہم

کس جگہ لے جائیں تیرے ظلم کی فریاد ہم
تجھ ہی سے تیرے ستم کی چاہتے ہیں داد ہم

حاتم کی اس غزل پر تاباں نے بھی طبع آزمائی اس طرح کی تھی۔

سو طرح سے گر کریں گے نالۂ و فریاد ہم　　اس قفس سے تو بھی ہو سکتے نہیں آزاد ہم[۱]

(ل) انعام اللہ خاں یقین (م ۱۱۶۹ھ) کی ایک غزل کا مطلع تھا:-

خار سے مژگاں کے جی ڈرتا ہے میرا بے طرح　　رکھ مری آنکھوں پہ دیتے ہو کف پا بے طرح

اس غزل پر ۱۱۵۵ھ[۲] میں حاتم نے یہ غزل لکھی تھی:-

ع: جی دیا حاتم نے کیا بے وقت، بے جا بے طرح

اور تاباں نے اپنی غزل اس طرح شروع کی تھی:-

پھر بہار آتی ہے جی ڈرتا ہے میرا بے طرح　　ہر طرف شورِ جنوں ہووے گا برپا بے طرح

(د) یقین کی ایک اور زمین ہے:-

گالی بھی سہہ گئے ہیں ماریں بھی کھائیاں ہیں　　کیا کیا تری جفائیں ہم نے اُٹھائیاں ہیں

اس غزل پر ۱۱۵۶ھ[۳] میں حاتم نے یہ غزل لکھی تھی:-

---

[۱] سرگذشت حاتم۔ صفحہ ۱۱۳

[۲] سرگذشت حاتم۔ صفحہ ۱۱۳۔ لیکن اس میں ایک مصرع ملتا ہے:-

ع جب سے تری ادائیں عالم کو بھائیاں ہیں

اوپر کی قرأت گلشنِ ہند (صفحہ ۱۰۳) کے مطابق ہے۔

جب سے تمھاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں ‌ تب سے جہاں میں تم نے دھومیں مچائیاں ہیں

حاتم کی اس غزل پر تاباں نے یہ غزل لکھی تھی :۔

سن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں

کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

(ز) یقین کی ایک اور غزل ہے :۔

دل نہیں کھنچتا ہے بن تیرے بیاباں کی طرف ‌ خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف

۱۱۵۷ھ میں حاتم نے اس غزل پر غزل لکھی تھی :۔

دیکھ کر بلبل لب و رخسار خوباں کی طرف ‌ منھ پھرا کر بیٹھ گر بیٹھے گلستاں کی طرف

اس غزل کے مقطع میں حاتم نے پھر تاباں سے اپنا تعلق ظاہر کیا ہے :۔

ریختے کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت ‌ پر توجہ دل کی ہے ہر آن تاباں کی طرف

اور تاباں نے بھی اپنی غزل میں استاد کا ذکر کیا ہے۔ مطلع اور مقطع اس طرح ہے :۔

جو کوئی دیکھے تری زلف پریشاں کی طرف ‌ سیر کے تئیں پھر نہ جاوے سنبلستاں کی طرف

اور ہی رتبہ ہوا ہے تب سے اس کے شعر کا ‌ جب سے حاتم نے توجہ کی ہے تاباں کی طرف

(ح) حاتم جیسے بے نفس بزرگ نے اپنے شاگرد کے علاوہ دوسرے کم رتبہ

سلہ بحوالۂ سرگذشت حاتم ص ۱۷ ۔ ۱۱۳ ۔ یقین کے ایک مصرع کو تاباں نے ایک مخمس میں تضمین کیا ہے۔ دیکھیں دیوانِ تاباں صفحہ ۲۱۷ ۔

شاعروں کی غزلوں پر بھی غزلیں لکھی ہیں۔ ۱۱۵۸ھ[1] میں تاباںؔ کی زمین میں خود بھی غزل لکھی ہے اور اس کا اعتراف دیوان زادے[2] میں کیا ہے۔ وہ غزل یہ ہے:

گیا مدرسے میں دہر کے الٹی ہوا ابھی — واعظ "نہی" کو "امر" کہے "امر" کو "نہی"
راضی ہو گر ہماری جفا پر تو یوں صحیح — پر ہم نے جان اتنی کسو کی نہیں سہی
کس کی زیادتی ہے ٹک انصاف تو کرو — ہم نے کہی تھی ایک تمھیں تم نے سو کہی
حاتم کو لے چلو کہ ترے عاشقوں کے بیچ — ڈھونڈھے تھا جس کے تیں سو گنہگار ہے یہی

تاباںؔ کی یہ زمین جو حاتمؔ کو پسند آئی تھی اس طرح ہے:

۱۹ ایک دن بھی ہنس کے بات نہ اس شوخ نے کہی — مجھ کو تمام عمر یہی آرزو رہی
عاشق نے وقت مرگ کہا یار سے یہی — بھولوں گا تجھ سے حشر کے دن دیکھ تو سہی
دیکھا جو میری نبض کو کہنے لگا طبیب — مجنوں موا تھا جس سے یہ آزار ہے وہی
یاراں ہمارے اشک کو کیوں کر پہنچ سکے — پھرتی ہے موج اشک کی بھی یاں بہی بہی
تاباںؔ نے تجھ کو دیکھتے ہی اپنا جی دیا — سننے نہ پایا تیری نہ اپنی ہی کچھ کہی

---

[1] اس غزل میں مولوی عبدالحق صاحب نے متن (ص ۷۹) میں حشمت لکھا ہے جو درست نہیں کیونکہ حاتم کی غزل موجود ہے جس میں تاباں کا ذکر ہے۔ تاباں نے ایک اور غزل اسی زمین میں لکھی ہے۔

کر نظر تیرے خط اور زلف پریشاں کی طرف — دیکھتا نہیں میں کبھی سنبل و ریحاں کی طرف

[2] بحوالۂ سرگذشت حاتم۔ ص ۱۲۱ سودا نے بھی اس زمین میں غزل لکھی تھی۔

تاباں کی اس غزل کے علاوہ حاتم نے اپنے سے کم رتبہ شاعروں کی زمینیں بھی اختیار کی ہیں۔ دیوان زادے سے معلوم ہوتا ہے کہ حاتم نے عنایت خاں راسخ، انور خاں انور، جعفر علی صادق، میر محمد اسلم، میر حسین کلیم، عالمگیر ثانی اور فغاں وغیرہ کی غزلوں پر بھی غزلیں کہی تھیں۔ اور یہ شعراء یقیناً حاتم سے کم رتبہ تھے۔ فغاں کے متعلق حاتم کہتے ہیں۔

خوب گو سب ہیں لیکن اے حاتم　　　خوب سے خوب ہے فغاں کی زباں

اور خود اپنا عجز ظاہر کرتے ہیں کہ:۔

کئی دیواں کہہ چکا حاتم　　　اب تلک پر زباں نہیں ہے درست

"مضمون و معنی" کے متعلق بھی عجز ہے کہ:۔

ہمیں مضمون و معنی سے نہیں کچھ ربط اے حاتم
نشے کی لہریں جو دل میں آیا ہم بھی بک بیٹھے

اسی لئے حکیم قدرت اللہ قاسم نے مجموعۂ نغز میں حاتم کو "خلیق خوش مزاج و خلیق" لکھا ہے۔ اور یہ بھی کہ "درد لیشے بود نیک دین، صاحب یقین و شاعرے بود با تمکین"۔ لیکن میر نے نکات الشعراء میں انھیں بالکل نہیں بخشا۔ لکھتے ہیں کہ "مردیست جاہل متمکن و مقطع وضع دیر آشنا عنانہ دارد، و دریافتہ نمی شود کہ ایں رگ کہن بسبب شاعری است کہ ہیچ من دیگرے نیست یا وضع او ہمین است"۔ یہ قول میر کا ہے جن کی "بے دماغی" کی وجہ سے اسے

حقیقت سمجھنے میں تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ دیوان زادہ میں حاتم نے میر کی غزلوں پر بھی اپنی غزلیں ترتیب دی تھیں۔ اور اپنے سے کم رتبہ شاعروں کی زمینیں بھی اختیار کی تھیں۔ حاتم اور تاباں کی متعدد غزلیں ایسی بھی ملتی ہیں جو ہم طرح ہیں۔ لیکن تاباں کی وفات کے بعد حاتم نے لکھی تھیں۔ اور کچھ تاباں کے آخری عہد کی بھی ہیں۔ مثلاً حاتم :۔

نہیں معلوم میرے کام کا انجام کیا ہوگا — یہی ہے فکر ہر دن صبح کیا اور شام کیا ہوگا

(اس غزل کی صحیح تاریخ معلوم نہیں)

تاباں :۔

جو ہوگا رند مشرب اُس کو ڈر سی کام کیا ہوگا — اگر قاضی بھی اس پر بھیج دے اعلام کیا ہوگا

حاتم :۔

غنچے کہیں ہیں سر کو جھکا کر چمن کے بیچ — یعنی نہیں ہے جائے سخن اس دہن کے بیچ

سنہ ۱۱۶۱ ھ

تاباں :۔

کی ہم نے سیر خوب جہاں کے چمن کے بیچ — پائی نہ بو وفا کی کسی گلبدن کے بیچ

حاتم :۔

جو ذائقے سے درد کے دل آشنا نہیں — دنیا میں زندگی کا اُسے کچھ مزا نہیں

سنہ ۱۱۶۱ ھ

تاباں

لڑکا جو خوب رو ہے وہ مجھ سے بچا نہیں — وہ کون ہے کہ جس سے مرا دل ملا نہیں

فغاں کی زمین میں حاتم نے کہا تھا۔

گر تجھ سے دلِ آزار سے دل یار نہ ہوتا / تو دل کو کسو طرح سے آزار نہ ہوتا
سنہ ۱۱۶۱ھ [1]

تاباں کی غزل ہے:-

خوباں سے اگر مجھ کو سروکار نہ ہوتا / تو دل کو مرے ہائے کچھ آزار نہ ہوتا

حاتم:-

پہنچا زمیں سے نالہ مرا آسماں تلک / یہ کیا جو کچھ خبر نہ ہوئی دلستاں تلک
سنہ ۱۱۶۳ھ [2]

تاباں:-

رکھتا ہوں اے ہما تپشِ عشق یاں تلک / جل جاوے جو تو آوے مری استخواں تلک

---

[1] دیوان زادہ بحوالۂ سرگذشت حاتم صفحہ ۱۱۴۔ لیکن حسرت کے انتخاب میں اس کا سن سنہ ۱۱۶۹ھ ہے۔ فغاں کا مطلع پر دیوان یہ ہے:-

عالم میں اگر عشق کا بازار نہ ہوتا / کوئی کسی بندے کا خریدار نہ ہوتا

فغاں کی ایک اور زمین ہے:-

شمع رو خلوت میں مت دے راہ پروانے کے تیں / اے ترے قربان میں کیا کم ہوں جل جانے کے تیں

اور تاباں نے لکھا تھا:-

دست رس کیا حق نے دی ہے ہائے اس شانے کے تیں / کس طرح لپٹے ہیں جا زلفوں کے سلجھانے کے تیں

[2] سودا نے بھی یہ زمین اختیار کی تھی:-

ہے پرورشِ سخن کی مجھے اپنی جاں تلک / جوں شمع زندگانی مری ہے زباں تلک

حاتمؔ:-

...نوں سے مل گیا دل راہ میں ناگاہ کیا کیجے
جو کچھ ہونی تھی اُس پر ہو چکی اب آہ کیا کیجے

سنہ ۱۱۶۳ھ

تاباںؔ:-

...لے ہے غیر سے جا جا مرا دل خواہ کیا کیجے
مرا کچھ بس نہیں چلتا ہے اُس پر آہ کیا کیجے

حاتمؔ:-

...ارزو ہے ایک دن مستی میں ہو بے باک ہم
دختر رز کو اڑا لیں چل کے زیر تاک ہم

سنہ ۱۱۶۹ھ

تاباںؔ:-

...یار کے کوچے میں پھرتے ہیں نپٹ بے باک ہم
سر اگر کاٹے کوئی ہونے کے نہیں غم ناک ہم

حاتمؔ:-

...ار میں دیکھ کنارے سے بہار دامن
برق ہوتی ہے ترے آگے نثار دامن

سنہ ۱۱۷۳ھ[1]

تاباںؔ:-

اشک گلگوں سے بھرا بس کہ کنار دامن
کٹ گیا دیکھ کے گلچیں بھی بہار دامن

مذکورۂ بالا غزلوں کے علاوہ تاباںؔ نے حاتمؔ کی دوسری زمینیں بھی اختیار کی تھیں۔ ڈاکٹر زور نے سرگذشت حاتم میں ایسی دو غزلوں کی نشان دہی کی ہے۔ اور

---

[1] بیدار نے بھی لکھا ہے :-

خاک عاشق ہے جو ہوتی ہے نثار دامن
اے مری جان تو مت جھاڑ غبار دامن

(لطف صفحہ ۴۲)

اُن کے مقطعے پیش کئے ہیں۔ یعنی:-

(۱) کہا ہے دیکھ تاباں راست اُس خوش قد کو حاتم نے

اہاہاہا اہاہاہا اہاہاہا اہاہاہا!

(۲) تاباں خزاں کے آنے کی حاتم سے سن خبر

بلبل اُٹھی پکار چمن سے کہ ہائے گل!

یہاں پہلی غزل میں تو بے شک تاباں نے حاتم کو یاد کیا ہے اور یہی قرأت صحیح ہے۔ انجمن کے مطبوعہ نسخے (صفحہ ۱۵) میں پہلا مصرع مسخ ہو گیا ہے۔ لیکن دوسرے مقطع میں حاتم کی جگہ تاباں نے حشمت لکھا ہو گا۔ کیونکہ وہ غزل تذکرۂ گلشنِ ہند (صفحہ ۱۰۴) میں محمد علی حشمت سے منسوب ہے اور اس کا مطلع اس طرح ہے:-

جب آخزاں چمن میں ہوئی آشنائے گل تب عندلیب رو کے پکاری کہ ہائے گل

حشمت اور تاباں بہرحال حاتم اور حشمت[1] دونوں تاباں کے استاد تھے۔

اب ضرورت ہے کہ ان دونوں کی استادی کی مدت متعین کی جائے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ۱۱۳۵ھ سے ۱۱۵۸ھ تک مسلسل حاتم کی زمینوں میں تاباں نے غزلیں لکھی تھیں۔ اس کے بعد ۱۱۶۱ھ میں جب حشمت کا انتقال ہوا تو شاگرد نے مخمس کی

---

[1] حشمت شاگرد تھے مرزا عبدالغنی بیگ قبول کشمیری کے جو دہلی میں رہتے تھے۔ حشمت کے دو بھائی اور تھے یعنی عابد یار خاں اور مراد علی خاں جو شاہ عالم ثانی کے یہاں داروغہ جواہر خانہ تھے (تذکرۂ قدرت وخم خانۂ جاوید)

نکلی میں آخری بند میں اس طرح تاریخ لکھی :۔

تیرا تاباں غریب و خستہ جگر فکر تاریخ میں تھا حد مضطر
مصرع آخری پہ کی جو نظر کہ دے ہاتف نے اس کو دی یہ خبر

ہائے حشمت[۲۴] شہید وا ویلا

۲۴ + ۷ ۳۰ ۱۱ = ۱۱۶۱ھ

یعنی سنہ ۱۱۶۱ھ میں حشمت کا انتقال ہوا۔ تاباں نے ایک رباعی حشمت کی زندگی میں اس طرح کہی تھی :۔

ہم کو تو تمہارے غم میں جینا ہے محال تم ہم کو لکھو کہ ہے تمہارا کیا حال
دو سال جو ہم تم رہے یک جا حشمت اب اس کے عوض ہجر کا ہے روز ہی سال

(صفحہ ۲۰۳)

اس رباعی میں تاباں نے "دو سال" کی صحبت کا ذکر کیا ہے۔ اور دوسرے مصرع میں "تم ہم کو لکھو" دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ حشمت کسی دوسری جگہ (یعنی مراد آباد) چلے گئے تھے۔ اسی فراق میں ایک دوسری رباعی ہے :۔

سب غم مجھے باتوں میں تری بھولے ہے پھر آ کے ہوئے ہجر میں تیرے اکٹھے
روتا ہوں میں اس غم سے کہ تجھ بن حشمت اب کس سے کہوں کہ میرے آنسو پوچھے

(صفحہ ۲۰۴) [۱]

---

[۱] دیوان تاباں صفحہ ۲۰۵ میں ایک رباعی یہ ہے :۔ (صفحہ ۱۸۴ پر)

"دو سال" کی صحبت کے بعد ممکن ہے کہ یہ فراق اُسی معاربے اور ہنگامے کی وجہ سے ہوا ہو جو مراد آباد میں رونما ہوا تھا۔ جس کے متعلق حشمت کے ذیل میں تذکروں میں آتا ہے کہ "ہمت مردانہ داشت۔ چنانچہ ہمراہ قطب الدین خاں در مراد آباد کہ محاربہ با پسران علی محمد خاں روہیلہ روداده بود بہ دلیری کشتہ شد۔"[1]

بہر حال تاباں اور حشمت کی صحبت کے یہ دو سال سنہ ۱۱۶۱ھ سے پہلے گزرے ہوں گے۔ اس سے قبل یعنی سنہ ۱۱۵۹ھ میں نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام شہید ہوئے تھے۔ جن کی شہادت پر تاباں نے لکھا تھا:۔

تاریخ وفات میں خرد نے "مارا ہے امیر خاں" خبر دی
۱۱۵۹ھ

چنانچہ ظاہر ہے کہ وہ مثنوی جو امیر خاں اور حشمت دونوں کی مدح میں تاباں نے لکھی تھی وہ سنہ ۱۱۵۹ھ سے پہلے کی ہوگی۔ یوں بھی حشمت اور تاباں کا تعلق سنہ ۱۱۵۷ھ سے پہلے بھی ثابت ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ تاباں کے ایک دوست سیدی احمد تھے جو غالباً فوج میں تھے اور اُن کی وفات پر سنہ ۱۱۵۷ھ کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۳) میں ہجر میں رہتا ہوں تمھارے رنجور — اب تو مجھ میں رہا نہیں کچھ مقدور
نزدیک نہیں کہ ہووے ہر لالہ بجوں — گردش نے فلک کی ہائے کیا ہے گا دور

[1] لطف - ۱۰۴ — قطب الدین خاں پوتے تھے نواب نعمت اللہ خاں رئیس مراد آباد کے۔

قطعۂ تاریخ تاباںؔ کے دیوان (صفحہ ۲۷۰) میں موجود ہے۔ اُن کے اور حشمتؔ کے متعلق بہ یک وقت ایک مخمس کے آخری دو بند میں تاباںؔ نے کہا ہے:۔

کبھی دیکھا نہیں ہے رحم اس خوں خوار پیارے میں — نہیں رہتی ہے ہرگز جان اس ظالم کے مارے میں
جدا عاشق کے تن سے سر کرے ہے اک اشارے میں — نہ ہووے کیونکہ دہشت اس ستمگر یار دل ہارے میں

یہ ابرو سیدی احمدؔ کی ہے گویا تیغ فولادی

نہ ہوں مشتاق اس دنیا میں تاباںؔ شان و شوکت کا — نہ اب دل میں مرے ہے شوق ان خوباں کی الفت کا
لکھا میں چاہتا ہوں اب ان دنوں دیوان حشمتؔ کا — مجھے سے آشنائی ہی نہیں محتاج دولت کا

بہ شرط آں کہ پیدا ہووے کاغذ دولت آبادی[1]

اس مخمس میں چونکہ سیدی احمدؔ (المتوفی ۱۱۵۷ھ) اور حشمتؔ کا ذکر ہے اس لیے ظاہر ہے کہ وہ ۱۱۵۷ھ سے پہلے لکھا گیا ہوگا۔ یعنی اس سنہ سے پہلے ہی حشمتؔ سے تاباںؔ کا تعلق ہو چکا ہوگا۔ اور یہ جو مصرع ہے کہ ع مجھ سے آشنائی ہے نہیں محتاج دولت کا۔ یہ اشارہ ہے اس بات کا کہ تاباںؔ کا تعلق حشمتؔ جیسے گمنام شاعر سے کچھ اُن کی شاعرانہ عظمت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ "حاجت روائی" کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ مثنوی جس میں حشمتؔ اور نواب امیر خاںؔ جیسے "مجھ سے آشنائی" ظاہر کی گئی ہے اُس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ اُس میں پہلے حشمتؔ کی بہت سی صفتیں بیان کی ہیں۔ یعنی حکمت، رمل، ہیئت، نجوم، منطق، اشراق،

---

[1] دیوان تاباںؔ صفحہ ۲۱۴۔

کیمیا، حدیث، تصوف وغیرہ علوم کا ماہر بتا کر یوں کہا ہے :۔

کسی کو کہاں اُس سے ہے برتری — کہ ہے نام اُس کا محمد علیؒ
تخلص بھی حشمت ہے اُس کا بجا — وہ اہلِ سخن بیچ ہے بادشا
غرض اُس سا کوئی نہ ہوگا کبھی — جوں احمدؐ پہ ہوئی ختم پیغمبری
کوئی آج اُس کے برابر نہیں — وہ سب کچھ ہے الا پیمبر نہیں
زیادہ کہوں وصف میں اُس کا کیا — بہ صورت ہے انسان بمعنی خدا

اِس آخری شعر میں تاباںؔ نے انتہائی مبالغے سے کام لیا ہے۔ ایک غزل میں جو حشمتؔ کی مدح میں ہے تاباںؔ نے لکھا ہے کہ حشمت کی وجہ سے "دولتِ دنیا" اور "سیم وزر" کی اب کیا حاجت ہے بلکہ "ظلِ ہما" کی بھی اب پروا نہیں ہے۔ وہ غزل یہ ہے۔

ہوا ہوں اس جہاں میں دل سے تیرا آشنا حشمتؔ
کروں میں دولتِ دنیا کے تئیں اب لے کے کیا حشمتؔ
جو تیرا آشنا ہو اُس کو سیم وزر سے کیا حاجت
میں تیرے ربط کے تئیں جانتا ہوں کیمیا حشمتؔ

؎ ایک غزل میں تاباںؔ نے کہا ہے :۔

نہ ملانے جو کوئی حشمتؔ کو تاباںؔ
وہ دشمن ہے محمدؐ اور علیؓ کا

نہ ہوں محتاج دنیا میں کسی شاہ و گدا کا میں
رہے لطف و کرم ایسا ہی گر مجھ پر ترا حشمتؔ

تری باتوں میں اپنا درد و غم سب بھول جاتا ہوں
کروں کس طرح تجھ کو آپ سے اک دم جدا حشمتؔ

ہے سب کو آرزو ظلِ ہما کی مجھ کو کیا پروا
قیامت تک رہے سر پہ مرے سایہ ترا حشمتؔ

سخن کے بحر میں آکے مری کشتی تباہی تھی
کنارے آ لگی جب سے ہوا تو ناخدا حشمتؔ

پرستش کیوں نہ دنیا میں کریں ہم اس کی اے تاباںؔ
ہمارا قبلہ حشمتؔ، دیں حشمتؔ، رہنما حشمتؔ

اس غزل میں شروع کے تین شعر اور پھر پانچویں شعر سے صاف ظاہر ہے کہ حشمتؔ کی صحبت "کیمیا اثر" (شعر نمبر ۲) تھی جو اغلب ہے کہ نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی تربیت کی وجہ سے ہو گی۔ اور نواب نے شاعری ہی کی وجہ سے "حشمتؔ کو اس قدر نوازا ہو گا کہ حشمتؔ سے تعلق رکھنے والے (تاباںؔ) بھی سیم و زر کے محتاج نہ رہے ہوں گے۔ حشمتؔ کی کیمیا اثر صحبت کا ایک اور شعر میں اس طرح اظہار کیا ہے:-

آشنا حشمتؔ سا رکھتا ہوں، نہیں محتاج میں
کیمیا کا علم تاباں مجھ کو کیا درکار ہے

بہر حال سیدی احمد (المتوفی سنہ ۱۱۵۷ھ) اور حشمت کا ذکر بیک وقت کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سنہ سے قبل تاباں کا تعلق حشمت سے ہو چکا تھا۔

اب دوسری طرف آئیے۔ یعنی حاتم کے اُس تعلق پر غور کیجیے جو اُن کو نواب امیر خاں انجام سے تھا۔ یعنی نواب کی فرمائش پر حاتم نے ایک مثنوی "قہوہ" لکھی تھی جیسا کہ اُس کے عنوان سے ظاہر ہے یعنی "حسب الارشاد نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر"[1] اس نواب "ادب نواز" کی صحبت میں حاتم نے کچھ وقت ضرور گزارا تھا، اور باورچی خانہ کے داروغہ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی تھی۔ کیونکہ جب حاتم نے اس ملازمت سے استعفا چاہا تو یہ منظوم عرضی پیش کی تھی۔

عرضی بہ جناب عمدۃ الملک در استعفاءِ خدمت در سنہ ۱۱۵۵ھ

تمھارا عمدۃ الملک اس قدر سے خوانِ نعمت ہے — کہ جس پر رات دن شاہ و گدا مہمانِ نعمت ہے

سحر سے شام تک اور شام سے تا صبح مدت تک — ہمارا کام تیری بزم میں سامانِ نعمت ہے

ہوا ہوں سیر ایسی چاشنی سے چشک کی تیری — خدا شاہد ہے کس کافر کے تیں ارمانِ نعمت ہے

جیوں گا جب تلک حق نمک تیرا نہ بھولوں گا — مجھے سب یاد ہے جو جو ترا احسانِ نعمت ہے

ہوا ہوں جب سے داروغہ ترے باورچی خانے کا — اگر شکوہ کروں اس کا تو یہ کفرانِ نعمت ہے

ولیکن کھا گئی ہے مجھ کو رات اور دن کی یہ محنت — ہے مطبخ کانِ نعمت، پر مجھے زندانِ نعمت ہے

یہی ہے عرض خدمت میں تری حاتم بکاول کی — کہ یہ خدمت اُسے دے جو کوئی خواہانِ نعمت ہے

[1] سرگزشت حاتم۔ صفحہ ۳۲

حاتم کے استعفا سے اُن کا استغنا ظاہر ہے۔ ڈاکٹر زور نے[1] اس نظم کی تاریخ میں ۱۱۴۵ھ لکھا ہے۔ لیکن حسرت نے اپنے انتخاب میں ۱۱۵۵ھ لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ۱۱۵۵ھ میں (یہی سال خود زور نے بھی "سرگذشت حاتم" کے صفحہ ۱۱۲ میں نقل کیا ہے)۔ حاتم نے میر محمد باقر حزیں کی غزل پر یہ غزل لکھی تھی:۔

کس جگہ لے جائیں تیرے ظلم کی فریاد ہم ۔ تجھ ہی سے تیرے ستم کی چاہتے ہیں داد ہم

اس غزل پر (تاباں کے علاوہ) خود نواب امیر خاں انجام (المتوفی ۱۱۵۹ھ) کی بھی ایک غزل تذکرۂ گلشن ہند (صفحہ ۱۴۲) میں ملتی ہے:۔

ٹک تو فرصت دے کہ جو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایے میں تھے آباد ہم
منھ ترا تکتے ہیں سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم
دل تو ہے داغ غلامی سے تری طاؤس وار
سامنے قمری کے گو ہیں سرو ساں آزاد ہم
اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر مانند شرر جب کہ چلے برباد ہم

---

[1] سرگذشت حاتم صفحہ ۴۳۔

ساتھ اپنے سر کے (ھے؟) انجام پاس تمکنت

شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ فولاد ہم

یعنی ۱۱۵۰ھ میں حاتم نے جو زمین اختیار کی تھی درباری تعلق کی وجہ سے اُسی کو انجام نے بھی اختیار کیا ہو گا۔ اس لیے اس سنہ کے بعد نہیں تو اسی سنہ میں انجام کی یہ غزل انجام پائی ہو گی۔ چنانچہ اس سال تک ضرور حاتم اور انجام کا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۱۱۵۵ھ میں حاتم نے استعفا دیا ہو گا۔ اور اس کے بعد ہی حشمت کو (ممکن ہے کہ اسی باورچی خانے کے داروغہ کی) خدمت سپرد ہوئی ہو گی جس کے متعلق حاتم نے یہ عرض کی تھی:- ع

کہ یہ خدمت اُسے دے جو کوئی خواہاں لعمت ہے

غرض کہ ۱۱۴۵ھ کے بعد اور سیدی احمد کے انتقال (۱۱۵۷ھ) سے پہلے (یعنی ۱۱۵۶ھ کے قریب) حشمت کا تعلق نواب امیر خاں انجام سے ہوا ہو گا۔ اور جوں ہی حاتم کے مالی زوال پہ حشمت کو عروج حاصل ہوا ہو گا تو اُسی زمانے میں تاباں نے بھی مالی منفعت کی غرض سے حشمت سے ناتا جوڑ کر یوں کہا ہو گا کہ:-

سخن کے بحر میں آ کے مری کشتی تباہی تھی

کنارے آ لگی جب سے ہوا تو ناخدا حشمت

ممکن ہے کہ تاباںؔ کو اس تعلق کی ضرورت شراب کی کثرت کی وجہ سے پیش آئی ہو۔ جس کا ذکر میرؔ نے بڑے افسوس کے ساتھ کیا ہے کہ اسی وجہ سے تاباںؔ کا انتقال ہوا۔ چنانچہ تاباںؔ نے شراب پینے کی خوشی کا ذکر رسمیہ نہیں بلکہ حقیقت میں کیا ہو گا۔ ایک رباعی اس طرح ہے:۔

ہے مجھ کو بہت شراب پینے کی خوشی یا ہے مجھ کو مطالعہ سفینے کی خوشی
چھٹ اس کے میں آزاد ہوں سب سے تاباںؔ مرنے کا نہ غم ہے کچھ نہ جینے کی خوشی

اور مثنوی کے یہ دو شعر بھی قابلِ غور ہیں:۔

مجھے بھی پلائے تو ساقی اتنی کہ پیتے ہی پیتے نکل جائے جی
اٹھوں حشر کے دن نہایت ہی مست ہو اُس روز بھی جام دینا بدست

بہر حال مذکورۂ بالا بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ تاباںؔ نے حاتمؔ ہی سے استفادہ کیا تھا۔ صرف آخر آخر میں "حاجت روائی" کی خاطر حشمتؔ سے تعلق پیدا کیا جو ۱۱۵۶ھ کے قریب شروع ہوا ہو گا۔ اور چونکہ حشمتؔ آخر میں استاد ہوئے تھے اس لئے میرؔ نے جب ۱۱۶۵ھ میں اپنا تذکرہ مکمل کیا تو حشمتؔ ہی کو تاباںؔ کا استاد لکھا۔

اب تاباںؔ کے سالِ وفات پر غور کرنا ہے۔ میرؔ نے اپنا تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں مکمل کیا تھا۔ اس میں انھوں نے تاباںؔ کی وفات کا حال لکھا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ۱۱۶۵ھ سے پہلے تاباںؔ کا انتقال ہو چکا ہو گا۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ۱۱۶۱ھ میں تاباںؔ نے اپنے استاد حشمت کی وفات پر تاریخ لکھی تھی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ تاباں کا انتقال ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان ہوا ہوگا۔ لیکن اگر ابراہیم اور لطف کا قول صحیح مان لیا جائے، (گلشنِ ہند صفحہ ۸۳) کہ تاباں کا انتقال محمد شاہ (المتوفی ۱۱۶۱ھ) کے زمانے میں ہوا تو پھر ظاہر ہے کہ ۱۱۶۱ھ کے اواخر میں ہوا ہوگا۔

کلامِ تاباں کی اہمیت تاباں کا کلام تاریخی اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے بھی اہم ہے۔ اس میں کچھ تاباں کے ذاتی حالات اور رجحانات کا ذکر بھی ملتا ہے اور کچھ معاشرے کی کیفیات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے اہمیت یوں ہے کہ اس میں نواب امیر خاں (۱۱۵۹ھ)، روشن رائے (۱۱۵۳ھ)، شرف الدین مضمون (۱۱۴۷ھ)، شرف الدین پیام (۱۱۵۷ھ) سید محی احمد (۱۱۵۷ھ) اور حشمت (۱۱۶۱ھ) وغیرہ کی وفات کی تاریخیں ملتی ہیں۔ اور ان میں سے بعض ایسی ہیں جن کا ذکر کسی اور کتاب میں نہیں آتا۔

تاباں اپنے حالات کے متعلق بھی اشارہ کرتے ہیں کہ :-

پالکی بھی مجھے خدا نے دی — تو بھی تاباں رہا میں خانہ بدوش

تاباں مرے مذہب کو تو مت پوچھ کہ کیا ہے
مقبول ہوں خلاق کا، مردودِ خلائق

ہے وہ احمق جو رکھے مجھ سے جدائی تاباں — گو نہیں نیک کسی سے تو نہیں ہے بد بھی

ایک اور رباعی میں اپنی غریبی کی طرف اشارہ کرتے ہیں :-

ہے شاہ و گدا میں فرق لیکن تاباں　　آزاد کے نزدیک ہیں دونوں یکساں
شاکی تو کسی طرح سے دنیا میں نہ رہ　　دن عمر کے ہر طرح سے کٹ جائیں یہاں

اپنے محبوب سلیمان مرزا کی تعریف بھی کی ہے :-

سلیماں میرزا سا خوب صورت　　نہیں اس دور میں کوئی زیر افلاک
سلیماں دوسرا بھی ہے ولیکن　　چہ نسبت خاک را با عالم پاک

تاباں اپنے شعری رجحانات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں :-

گو شاعر آسماں ہیں زمینِ غزل کے سب　　تاباں کو فکر شعر میں ہے آسماں کی سیر
تاباں بجز تلاش نہیں شعر کا مزا　　پھیکا ہے وہ طعام نہ جس میں نمک پڑے

کہا ہے اس زمیں میں ریختہ تاباں نے یہ ایسا
کہ کیسا ہی کوئی ہو سنگ دل اس کو رلا دیوے

اور وہ مضمون (م سنہ ۱۱۴۵ھ) اور سودا (م سنہ ۱۱۹۵ھ) کے

ل لطف نے (صفحہ ۸۲) لکھا ہے کہ تاباں کے "منظور نظر" سلیمان کو سنہ ۱۲۰۱ھ میں انھوں نے لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ سکینہ کو لطف کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی اور انھوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ لطف نے سنہ ۱۲۰۱ھ میں خود تاباں کو دیکھا تھا۔

تاباں کا ایک اور شعر ہے :-

سلیماں کیا ہوا گر تو نظر آتا نہیں مجھ کو　　مری آنکھوں کی پتلی میں تری تصویر پھرتی ہے

ریختے کی تعریف کرتے ہیں :۔

کہا میں چاہتا ہوں ریختہ جس وقت اے تاباںؔ

مجھے بے اختیار اُس وقت مضموں یاد آتا ہے

آبروؔ، یکرنگؔ، ناجیؔ، احسن اللہؔ و دلیؔ

ریختہ کہتے نہ تھے تاباںؔ مرے سوداؔ کی طرح

معاشرے کا حال بھی بیان کیا ہے کہ لوگوں میں "مکاری" زیادہ ہے۔

جو مردمِ دنیا ہیں سو مکار ہیں سب ۔ میں جان بزرگ آپ کروں کس کا ادب

فارغ ہوں میں دو جہاں سے تاباںؔ مجھ کو ۔ دنیا سے نہ کچھ کام نہ دیں سے مطلب

یہ تو "مردمِ دنیا" کی کیفیت تھی اور "مردمِ دین" کا حال یہ تھا کہ :۔

کہتا ہے نماز پڑھ کے یارب دلخواہ ۔ ہو کوئی مرید صاحبِ حشمت و جاہ

بیٹھا ہے اسی فکر میں لے کر تسبیح ۔ کیا شیخ کی اوقات ہے سبحان اللہ

چنانچہ اس قسم کی تسبیح پھیرنے والوں کی مذمت کی ہے کہ خاکِ کربلا کی تسبیح رکھتے ہیں لیکن اس کے اہل نہیں ہیں کہتے ہیں کہ :۔

تسبیح وہ خاکِ کربلا کی رکھے،

تاباںؔ جو دل سے ہووے شبیرؑ کا دوست

گر غیر اُسے گلے میں اپنے پہنے،

خونِ شہدا تمام بر گردنِ اوست

اس قسم کے ریاکار پیروں کی ایک اور رباعی میں مذمت کی ہے کہ:

تاباںؔ یہاں کوئی نہیں صاحب ارشاد
اس سعی میں مت عمر کر دے تو برباد
ایسا کوئی کم ہے جو نہ ہووے پابند
یوں نام کے تئیں تو سرو بھی ہے آزاد

تاہم اُن کو صحیح قسم کے پیر حضرت مظہر جان جاناں مل گئے تھے۔ جن کی غزلوں پر بھی تاباںؔ نے تضمین لکھی تھی۔

متینؔ برہان پوری کے اُردو مرثیے[1]

صوبۂ ممالک متوسط (سی۔پی) کا مشہور شہر برہان پور علوم و فنون کا مرکز رہ چکا ہے۔ اس کے قایم ہونے کے متعلق روایت ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے حکم سے اُن کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی سنہ ۷۳۸ھ مطابق سنہ ۱۳۳۷ع) جب سنہ ۷۲۰ھ میں دکن جاتے ہوئے اُس مقام پر پہنچے جسے پہلے لبسانا کہتے تھے اور وہاں ایک بزرگ "پیر بتا" کا مزار بھی تھا تو اُنھوں نے عالمِ مثال میں اس شہر برہان پور کو دیکھا اور اُس کے آباد ہونے کی پیشین گوئی فرمائی۔ اس واقعے کے قریب ایک صدی بعد (یعنی سنہ ۸۰۱ھ تا سنہ ۸۱۰ھ) خاندیش کے ولی صفت والی یعنی غزنیں خاں المعروف نصیر خاں ابن ملک راجہ فاروقی نے قلعۂ اسیر پر تسلّط حاصل کیا تو اپنے مرشد حضرت

[1] رسالہ "اُردو" کراچی۔ بابت اپریل سنہ ۱۹۵۶ع

شیخ زین الدین داؤد شیرازیؒ کے نام پر تاپتی ندی کے مشرقی کنارے پر زین پور آباد کیا اور مغربی کنارے پر اپنے دادا پیر حضرت برہان الدین غریبؒ کے نام پر برہان پور قائم کیا۔ اس وقت سے، نصیر خاں کا فاروقی خاندان قریب دو سال تک، برہان پور اور اُس کے مضافات پر حکومت کرتا رہا۔ اور اُس کے چودہ افراد حکمران ہوئے۔ پھر اکبر کے زمانے میں یہ علاقہ مغلوں کے تسلط میں آگیا۔ اور سیاسی اعتبار سے دکن کے لیے اہم مرکز بن گیا۔ چنانچہ آثارِ قدیمہ کی وجہ سے یہ علاقہ اب بھی خصوصیت رکھتا ہے اور علماء کے نفوسِ قدسیہ سے اب بھی خالی نہیں ہے۔

قدیم اُردو شاعری اور خصوصاً اُردو مرثیے کے لیے برہان پور خاص شہرت رکھتا ہے۔ تذکرۂ شعرائے دکن (عبدالجبار ملکاپوری)، اُردو شہ پارے (ڈاکٹر زور) چمنستانِ شعراء (لچھمی نرائن شفیق)، دکن میں اُردو (نصیر الدین ہاشمی) وغیرہ کتابوں میں ان شعراء کا ذکر آتا ہے۔ ہاشم علی برہان پوری کے "دیوانِ حسینی" کا ذکر مولانا سلیمان ندوی نے نقوشِ سلیمانی میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ ۱۱۶۸ھ تک ضرور زندہ تھا۔[۱]

---

[۱] مولانا کا خیال ہے (نقوشِ سلیمانی۔ دوسرا ایڈیشن۔ صفحہ ۲۳۸) کہ ہاشم علی کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گجرات میں قیام پذیر تھا:۔

گجرات میں پڑے جب یہ مرثیہ کو یاراں ۔۔۔ سن کر چلے ہیں رنڈے دکھنی دکن کوں اپنے

نصیر الدین ہاشمی نے "یورپ میں دکنی مخطوطات" (صفحہ ۶،۴۴) میں اُس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ ہاشم علی اُس فارسی شاعر خواجہ ہاشم ابن خواجہ محمد قاسم سے مختلف ہے جو حضرت "مجدد الف ثانی" سرہندی علیہ الرحمۃ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) کے مرید تھے۔

میرے کرم فرما جناب مولانا راشد برہان پوری[1] کے نادر ذخیرے میں

[1] مولانا کی عین شفقت ہے کہ متین کا بہت سا کلام خود ہی نقل کر کے عنایت فرمایا۔

اُن کے پاس ایک در متین کا ایک قطعہ تاریخ ملتا ہے جو اُس نے مولانا جلال الدین "اللہ والے" برہان پوری کی وفات پر لکھا تھا:-

اللہ کے حضور اقدس میں جا کے پہنچے — دنیا کے چھوڑ قصے خوش حال اور مسرور
ہاتف نے دی خبر یوں تاریخ یہ متین کو — اللہ والے صاحب جنت نصیب مبرور
(۱۲۶۷ھ)

راقم کے پاس میر محمد باقر برہان پوری کا ایک مرثیہ غزل کے انداز میں موجود ہے۔ جس کی تاریخ بیاض میں ۲۹ ذلقعدہ ۱۲۰۴ھ درج ہے:-

ہے ہے حسین سرور ساقی دو جہانی — مجروح ہے کربلا میں محتاج قطرہ پانی
ہیہات شامیاں نے ڈالے ہیں شام جگ پر — خونی ابر میں کر کر پنہاں مہ نورانی
یارب مرے جگر کوں ناحق یہ کوفیاں نے — ماٹی منے ملائی اُس کی یہ نوجوانی
بے تاب ہو کر اصغر کرتے اشارے لب سوں — پانی بدل لگا تیر اس پیاسے کے رو جانی
ہے ہے یہ ظالماں نے رکھا نہیں ادب کچھ — جس ذات سروری کا جگ میں نہیں ہے ثانی

(باقی صفحہ ۱۹۹ پر)

متینؔ برہان پوری کے مراثی کا ایک مجموعہ ملتا ہے جو یہاں پیش کیا جاتا ہے
لچھمی نرائن شفیقؔ نے چمنستان شعراء (۱۱۷۵ھ) میں اس شاعر کے متعلق لکھا ہے:۔

"میر مہدی متینؔ تخلص، مولدش برہان پور ست۔ و والدش
میر محمد امین مقرب دربار شاہی است۔ صاحب سخن و شاگرد
میرزا بیدل بود۔ متینؔ ہم طالب علم جید و خلیق و کم سخن و
خوش فکر و متلاشی مضامین رنگین ست۔ اصلاح سخن از شاہ
سراج می کرد۔ این چند ابیات از طبع زاد اوست:

روزِ اول سے مجھے دردِ زباں ہے شیشہ   بات شیشہ ہی، سخن شیشہ، فغاں ہی شیشہ

اس بسنتی پوش قاتل پر چھڑک لوہو کا رنگ
عاشقو لازم ہے اب بھگوے کا سودا کیجیے

عرس کو مجنوں کے ہرنوں نے کیا ہے اتفاق   وحشیو لازم ہے تم بھی اپنے ساماں سے چلو
جان جاتا ہے مرا افسوس کوئی کہتا نہیں   آنسوؤ بیٹھے ہو کیا آنکھوں کے ایواں سے چلو

گل شاخ پر صبا سے ہلتے نہیں چمن میں
گلرو کے نیم بسمل سب تلملا رہے ہیں

یہ اشعار غزل کے ہیں۔ اگرچہ شفیقؔ کے معاصر متینؔ نے مرثیے بھی لکھے تھے

بقیہ حاشیہ ص ۱۹۸
دیکھو یہ رن میں گھوڑا اخالی پھرا ہے شہ کا   جا کر حرم قدم لے کرتے ہیں جاں فشانی
یک حرف مدح شہ میں بولا ہے جن نے باقرؔ   اُس کی بھی عرش و کرسی کرتے ہیں مرح خوانی

تو ممکن ہے کہ "چمنستانِ شعراء" کی تصنیف کے وقت (۱۱۷۵ھ) وہ زیادہ شہرت نہ رکھتے ہوں۔ یا اُس نے خود ہی اس صنف کو بعد میں سرمایۂ آخرت سمجھ کر شروع کیا ہو۔ کیونکہ اُس کے نام "میر مہدی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امامیہ معتقدات سے متعلق تھا۔ اور حسب ذیل اشعار بھی اسی نوعیت کے ہیں :-

جانشینی جن کو تھی حضرت رسول اللہ کی — اُس امام اولیں اوپر درود بے عدد
مصطفیٰ کے ظاہر و باطن کے نائب اور وصی — وہ[1] امیر المومنیں اوپر درود بے عدد
وارثِ علم لدنی، باعثِ عیدِ غدیر — منبعِ دیں وہ علی المرتضیٰ اوپر درود[2]

سراج اورنگ آبادی (المتوفی ۱۱۷۷ھ) کی شاگردی کی وجہ سے متین کے یہاں فنی پختگی بہت ہے اور بندش کی چستی میں بھی کم فرق نظر آتا ہے۔ قرآنی اور دینی تلمیحات کا استعمال بھی اس کے کمال میں اضافہ کرتا ہے مثلاً:

اُنوں کی ذات مقدس ہے معنیِ قرآں — شگفتہ ان سنتی تطہیر کا ہوا بستاں
تعریف میں تمھاری بذبحِ عظیم ہے — میدان کربلا کی اے قربانی السلام

---

[1] وو (وہ) تو غالب کے یہاں بھی ہے :-

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

[2] ایک سلام میں متین نے تمام اماموں کا ذکر بھی کیا ہے۔

کیا نہ تو نے رضینا بغیر کچھ گفتار ‏ ‏ اے ملکِ صبر کے سردر مرے یتیم حسین

کہے تھے جس کو رسولِ امجد زبان سوں اپنی کنت مولا

امامِ برحق، امیر عادل، ولیِ کامل، علی اعلےٰ

جنھوں کی شان میں لولاک خق نے فرمایا ‏ ‏ سو اُس امامِ ہدیٰ پر کہو درود و سلام

زمِ راکب جس کو بولے بوج کر ‏ ‏ خاک اور خوں میں پڑا ہے یا رسول

فارسی اور فارسیت سے بھی مثنین واقف ہے۔ ایک فارسی مرثیہ

بطرزِ مثنوی اس مجموعے میں یوں ملتا ہے :-

واحسرتا حسین گلِ باغِ فاطمہ ‏ ‏ او بود مرہم دل پر داغ فاطمہ

بر بے کسیش آہ نہ کردند یک نگاہ ‏ ‏ بارے جواب گو کہ چہ دیدی از و گناہ

او را بدشت تشنہ دہن ذبح ساختی ‏ ‏ از تیغ چوں غزال تو مجروح ساختی

انہی اشعار میں ایک نادر تشبیہ اس طرح آتی ہے :-

موے تنم بگفتنِ تغییر آں الم ‏ ‏ گردیدہ اند جملہ دو موچوں سرِ قلم

بعض اشعار میں فارسی لب و لہجہ بھی ہے۔ مثلاً :

زندگی اب تب مجھے ان کے بغیر از ہی عذاب ‏ ‏ آفتِ ظلم سے مسمار ہیں اولادِ علی

سر بیچ کر لیے ہو شہادت کوں مول تم ‏ ‏ تم پہ ہوا یہ مرتبہ ارزانی السلام

سبھی پریشاں ہو گئے زلفوں کے بال ‏ ‏ سر کا چہرہ ڈھل گیا اے ذوالجلال

مرحبا اے عارفِ اسرار وحدت السلام ‏ ‏ مرحبا اے مقصد و ممتازِ کثرت السلام

ظالم بتر قدم مل کے سبھی ہو کے حصار　　تیر برسائے وُو ہر سو سیتی جو ابر بہار
جن کوں افسوس نہیں طاقتِ تحریک نظر　　کیوں کے کائیں گے وہ اس ظلم اندکار کتئیں

اب رہا دکنی لب و لہجہ، تو یہ چیز مؔتین کے لیے لازمی تھی۔ کیوں کہ نربدا ندی کے جنوب میں جس قدر علاقہ ہے وہ سب کا سب دکن میں شمار ہوتا تھا۔ اور سیاسی اعتبار سے بھی وہ ایک ہی وحدت میں محسوب تھا۔ اسی لئے ایسے الفاظ جو دکن اور وسط ہند کے بعض علاقوں میں اب بھی رائج ہیں مؔتین کے یہاں عام ہیں۔ چند مثالیں یہ ہیں[1]۔ بھگونا، ڈبونا کو بھگانا ڈبانا بولتے ہیں۔

ماتھے کے اوپر تیر ستم گر نے لگایا　　منھ ریش تلک اپنا لہو میں وہ بھگایا
جب جد کوں وہ کر یاد بہی کہکے سنایا　　رخسار مرا خوں میں ستم گر نے ڈبایا
آہ خنجر نے ڈبایا خان دماں　　ہائے کیا طوفاں ہوا ہے یارسولؐ

(۲) الضاف چکانا:۔

جب بال کھلے غمزدہ آئیں گے پیمبرؐ　　الضاف یتیموں کا چکادیں گے پیمبرؐ

(۳) دھنسنا (گھُسنا)

ع۔ دھنس کر مرے ناموس پہ یوں ظلم سے آیا

---

[1] قدیم اُردو کا ایک مصدر "چھنانا" (چھڑانا) بھی آتا ہے۔

اسباب مرے ہائے یتیموں کا لٹاتے　　چادر کو چھنا سر کی، لگی خاک اُڑاتے

تلمنا (تلملانا) بھی آتا ہے۔ ع ہچکیاں لیتا ہوا دیکھوں کہ تلمتا دیکھوں۔

پڑ دوں میں اس طرح مُرد دیکھو دھنس کے آؤ — کچھ تو نبی کا اپنے تم خوف دل میں لاؤ
دھنس کے خیمے میں لیے لوٹ مگر بدذات — باندھنے لاگے غریبوں کو پکڑ ظلم سے ہات

(۴) نوانا (جھکانا) :-

ع۔ قدم دھرتا ہے کہہ کہہ کر رضینا سر نوا عابد
ع۔ میں صراحی سا تجھے رونے نہ دی گردن نوا

(۵) رس مسانا (سرشار ہونا) :-

جاں بلب جام شہادت سے تھے اب رس مسا — یا لہو پیتا دیکھوں یا ہچکیاں لیتا دیکھوں

(۶) دل کٹھن (ظالم) :-

مارتے ہیں عابدیں کو دل کٹھن — جو ہے محتاج دوا اے ذوالجلال

(۷) پرچھی (برآمدہ) :-

ع۔ رہیں ہم یک طرف پرچھی موں اور بھائی مرا عابد

(۸) اوجڑ (اُجڑا ہوا) :-

ظالموں کے ظلم سے جنگل کا ددا اوجڑ دیار — ہو گیا افسوس و سلطانِ سرور کا مقام
گیا سب ڈوب تاپا گھر کے اوجڑ ہوئی آبادانی — ہووے گا پار کیونکر اس بلا سے ناخدا عابد

(۹) کیجے کو کریجے لکھا ہے :-

دغا کریجے، جفا کریجے، کسی کو ماریجے زہر دیکر
جہاں میں چھوڑ دل گے ان کو جیتے، تو بدکرو گے خطا کرو گے

(۱۰) صابری (صبر) :-

صابری دیکھ وہاں اُن کی مصیبت نے کہا
مرحبا ذات تمھاری سیتی راضی ہے خدا

(۱۱) شمیانے (شامیانے) :-

دیدہ گریاں کے شمیانوں کو تانے ہیں یہاں
ڈوریاں جس کی لگی ہیں چو طرف آہ و فغاں

(۱۲) پکھوا (جھولا) :-

میرے پکھوے کی کہاں بابا سدھارے آج آئے
باپ بھی تیرا چلا اب جو کفن تجھ کو پنھائے

"احوال" کو غالباً ہمیشہ اُردو میں واحد ہی استعمال کیا گیا ہے۔ ولی نے کہا تھا :-

نہیں سنتا کوئی احوال میری دل فگاری کا
کہوں کس سوں گریباں چاک کر دکھ بے قراری کا

متین بھی لکھتا ہے :-

دکھلاویں گے احوالوں کو سب کے زبانی
دیکھو یہ مرے لخت جگر کی ہے نشانی

ولی کی طرح ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت و عطف بھی متین کے یہاں ہے۔ مثلاً :-

شہیدِ زہرِ ستم مرتضیٰؑ کے نورِ نَیَنْ
جگر بتولؑ کے وہ حضرتِ امام حسنؑ

علیؑ کے جان و جگر فاطمہؑ کے نورِ نَیَنْ
نبیؐ کے دل کے پیارے شہِ زمین و زمن

سر کے آلودہ تھے لوہو سیتی دندان و نَیَنْ
حلق کے خوں سیتی گلزار ہیں اولادِ علیؑ

لہ دکن اور ممالک متوسط کے بعض علاقوں میں اب بھی "اماں آئے" اور (باقی صفحہ ۲۰۵ پر)

مضاف الیہ میں نون کا اعلان عام ہے۔ مثلاً:۔

گلے پہ خنجرِ برّاں کوں لیا تو نے | مثالِ آپ دمِ تیغ کوں پیا تو نے
ظالم نے چلا خنجرِ برّاں دو دھارا | کاٹا جو اُسے، اُڑنے لگا خوں کا فوارا
اُدھر کراہ سیتی اشکِ خوں بہاتی تھی | کہ غرقِ خون ہوا ناخدا، حسین حسین

"سمجھانے" کا قافیہ "مانے" آیا ہے:۔

لگے سکینہ کو رو رو تمام سمجھانے | سمجھ یتیم کہ ہوتے ہیں جگ میں دُر دانے
گلے لگا کے اُسے جب کہ رو دیا مانے | گِری وہ خاک پر اور پکارا، حسین حسین

"بیوہ" کی جمع "بیوھوں" آئی ہے:۔

بیوھوں کو دیکھ کر زار و نزار | شہربانو کو کہا رو کر پُکار

(بقیہ حاشیہ ۲۰۴) "آپا گئے" بولتے ہیں۔ متین بھی لکھتا ہے:۔

شہربانو دیکھ کر کہنے لگے باشور و آہ | جیب پہ لوہو بھری اس طفل کے کر کر نگاہ

"اس" کے بجائے "یہ" اب بھی بولتے ہیں۔ متین لکھتا ہے:۔

ع۔ یہ بن میں تجھ کوں پدر کا وصال مشکل ہے

ع۔ ہے یہ جنگل میں مرے دلدار و دلبر کا مقام

علامت فاعل کا حذف عام ہے۔ میر کے یہاں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

متین کے یہاں مفعول کے لئے بھی حذف آتا ہے:۔

ع۔ قتل کرنا کب روا احمدؐ کی آل

سایہ وہ بوھوں کے اب سر سے ڈھل گیا ہے
غم خوار ہوں سو میں ہوں، دلدار ہوں سو میں ہوں

بعض پُرانے زیورات کا ذکر بھی آتا ہے۔ مثلاً ہنسلی (گلے کی) کی تشبیہ :-

تنگی سے گریباں کی نازک وہ گلے پر ، ہنسلی کی طرح گرچہ اٹھا تھا خطِ سیط

بلاق کی تشبیہ بھی آتی ہے :-

لے چلے ہیں حلقہ بند کر مجھ کوں یہ اہلِ نفاق
نوک پر پلکوں کے آنسو آرہے ہیں جوں بلاق

"کان کا موتی" بھی استعارہ ہے :-

ماٹی میں مرے ہائے ملا کان کا موتی جیوں اشک میں جاتی تھی دہا گور پہ روتی

یہ حقیقت ہے کہ متین کے یہاں بڑی لطیف تشبیہات و استعارات اور مختلف رعایات بھی ہیں۔ کچھ مثالیں اوپر آچکی ہیں۔ اور کچھ یہ ہیں

گیسو تمھارے بکھرے ہوئے رخ پہ ہیں گواہ کیا کیا لئے ہو سر پہ پریشانی السلام
کہتا ہے صبح اُٹھ کے متین صاف دل سیتی آئینہ دار جوہرِ انسانی السلام
زندگانی خاک ہے جو تم چلے سر کے چھتر ڈھل پڑے آنسو کے جب اشک بارونے سلام
طلب نگاہوں سے کرتے ہیں رو کے ہر دم آب سراب کا بھی جہاں احتمال مشکل ہے
بذبوح کر چلا ہو تم اے آہوئے حرم تم کو ہوئی ہے مرگ بیابانی السلام

ع۔ خنجر کی دھار حلق سے بہہ کر گذر گئی

اِن اوصاف کے علاوہ زورِ بیان پیدا کرنے کے لیے متین نے کبھی استفہامیہ انداز اختیار کیا ہے اور کبھی متضاد و متناقص کیفیات پیش کی ہیں۔ مثلاً :۔

بر بے کسیش آہ نہ کردند یک نگاہ ———— یارے جواب گو کہ چہ دیدی از گناہ؟

سر تن جدا پڑے ہیں تک آ کر نگہ کرو ———— کیا آپ کا نظام ہے یا حضرتِ رسولؐ

ایک دن وہ تھا کہ تھے سجدہ میں نانا غمگسار ———— جب ہوا پیارا نواسا پیٹھ پر آ کر سوار

ایک دن یہ ہے کہ ظالم سر لیے اس کا اُتار ———— ہائے محتاجِ کفن یوں ہو سے افشاں حسینؓ

اسی انداز سے یہ مرثیہ آخر تک چلا گیا ہے۔ ایک مرثیے کے ہر بند میں صرف ممدوح کے اوصاف بیان کیے ہیں اور اوصاف کے بیان سے زورِ کلام پیدا کرنے کی کوشش کی ہے :۔

وہ تمہارا دلبرِ جانی حسینؓ ———— وہ تمہارا ماہِ کنعانی حسینؓ

ہائے ڈوباخوں میں بن پانی حسینؓ ———— ناخدا اب تو خدا ہی یا رسولؐ

غرض کہ متین کا اسلوب یہی ہے اور پورے مجموعے میں یہی اوصاف مختلف مقامات میں موجود ہیں۔

اب ہم اِس مجموعے کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اس میں کل تیس[۳۰] مرثیے ہیں۔ جن میں سے دس درود و سلام سے متعلق ہیں اور بقیہ سب کے سب (سوائے ایک مسدس کے) مربع ہیں۔[۱] اشعار کی تعداد مجموعی طور پر قریب سوا سات سو ہو گی۔

---

[۱] حاشیہ صفحہ ۲۰۸ پر

عام واقعات وہی ہیں جو متین کے معاصرین میں سے ہاشم علی[1] اور سودا کے یہاں بھی ہیں۔ اور وہ اضافے نہیں ہیں جو بعد میں انیس اور دبیر کی وجہ سے نظر آتے ہیں۔

متین کا ایک مرثیہ فارسی میں بھی ہے[2]۔

واحسرتا حسین، گُلِ باغِ فاطمہ
او بود مرہمِ دلِ پُر داغِ فاطمہ

بر بے کسیش آہ نہ کردند یک نگاہ
بارے جواب گو کہ چہ دیدی از گناہ؟

او را بدشت تشنہ و مذبوح ساختی
از تیغ چوں غزال تو مجروح ساختی

بشنید چوں لعین بہ اقامت اشارہ کرد
لختِ دلِ شہنشہِ غمگیں دوپارہ کرد

رخصت بااہلِ بیت بسوئے وطن نمود
خود را بآبِ گریۂ خود غوطہ زن نمود

---

[1] ہاشم علی کے مرثیے مربع، مخمس اور غزل نما بھی ہیں اور سودا کے یہاں مثلث، مربع، مخمس، مسدس اور ترجیعات بھی ہیں۔

[2] متین کے متعدد مرثیے اسی مضمون کے ساتھ رسالہ "اردو" کراچی اپریل سنہ ۱۹۵۶ء میں آگئے ہیں۔ یہاں طوالت کی وجہ سے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

ظلم و ستم چہ بر شہِ بے جان ما شدہ ست
از جمع مصیبتِ پیغمبراں شدہ ست
گر حالِ تشنگیش کنم اند کے بیاں
آید ز جوشِ نالہ بروں از دہن زباں
موئے تنم بگفتنِ تفسیرِ آل الم؛
گردیدہ اند جملہ دو مو چوں سرِ قلم
دائم متیقؔ بفضلِ تو باشد امیدوار
بر خاکِ کربلائے تو جاں را کند نثار
بر گردش و مصیبتِ او یک نظر بکن
بر کوشش و محنتِ او یک نظر بکن
شاہا بہ بندگانِ خود اورا قبول کن
اورا نہ از شفاعتِ محشر ملول کن
از بسکہ او غلامِ تو باشد کجا رود
مرجوِ فیضِ عامِ تو باشد کجا رود
فرما یکے نگاہِ ترحم بحالِ او!
در سایۂ حمایتِ خود کن مآلِ او!

نکاتِ احسن[1]

موجودہ دور کے فضلاء، اُدباء اور شعراء بلکہ اونچے درجے کے طلباء میں بھی بہت کم ایسے ہوں گے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ حضرت احسن مارہروی سے واقف نہ ہوں۔ جلوۂ داغ، یادگارِ داغ، منتخباتِ داغ، انشائے داغ، لالہ سری رام کا خمخانۂ جاوید، ریاضِ سخن (ریاضِ خلیل) فصیح الملک، فصیح اللغات، کارنامۂ غم، کلیاتِ ولی، تاریخ نثر اردو، (نمونہ منثورات) کسوف الشمسین، اردو لشکر وغیرہ متعدد ادبی صحیفے ہیں جو اُردو کی رہتی دنیا تک رہیں گے۔ اور اُن کی یاد تازہ کریں گے۔ ان کے علاوہ اُردو قواعد، عروض املاء، صحتِ زبان و بیانِ انشاپردازی و شاعری میں بھی اُن کی خدمات اربابِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ علیگڑھ میگزین کے احسن نمبر اور "آجکل" (دہلی)

[1] رسالہ "حسن" رام پور۔ بابت جنوری ۱۹۴۹ء۔ حضرت ضمیر احسنی سلمہٗ نے مولانا احسن مارہروی کے مکاتیب کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے۔ یہ مضمون اسی مجموعہ کے مطالعہ سے تیار کیا گیا ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء وغیرہ مختلف رسالوں میں مرحوم کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ آج ہم اُن کے کچھ ایسے ادبی نکات پیش کرنا چاہتے ہیں جو کہنے کو تو موٹی موٹی باتیں ہیں لیکن اپنی افادیت میں بہت اہم ہیں۔ اور جو ایک دو دِن میں نہیں بلکہ بہت مدت تک اُن جیسے اساتذہ کی خدمت میں رہ کر ہی حاصل ہوا کرتی ہیں۔ ان ادبی نکات کو ہم اپنی سہولت کے لیئے تقسیم کیے لیتے ہیں اور پہلے زبان کے متعلق عرض کرنا چاہتے ہیں۔

زبان (۱) جناب اختر بریلوی کو لکھتے ہیں کہ: "لوٹنا" (پلٹنے کی جگہ) گنواری بولی ہے۔ اس لیے یہ مصرع

ایسا گیا کہ لوٹ کے لی ہی خبر نہیں

اس طرح ہوگا:۔ ع ایسا گیا کہ اُس نے پلٹ کر نہ لی خبر

پھر لکھتے ہیں کہ:۔

(۲) تنہا دیدہ لکھنا اُردو میں فصیح نہیں۔ اسی طرح بغیر ترکیب کے گوش لکھنا مذاقِ صحیح کے خلاف ہے۔

(خط بنام راز سہسوانی)

(۳) دلّی والے تیوری بر وزن رہبری بولتے ہیں۔ جیسے:۔

ع۔ سنتا ہوں تیوری ہے کسی کی چڑھی ہوئی۔ مگر

میں اب اس کو (یعنی تیوری بر وزن لوری) بھی جائز سمجھتا ہوں"۔ اصلاح اختر

اسی طرح دیوتا ہندی لفظ ہے بروزن فعلن بھی صحیح ہے اور بروزن فاع لن بھی (خط بنام ابرؔ احسنی)

(۴) "مزے دار مستند شعرار کے یہاں غیر مستند ہے مگر اردو بول چال میں ہے اس لیے میں جائز سمجھتا ہوں" (اصلاح اخترؔ)

(۵) "خلط ملط ہونا بولتے ہیں اور ربط ضبط بڑھانا صحیح ہے" (اصلاح اخترؔ)

(۶) "بغیر ترکیب جب جان لکھو تو نون کا اعلان کرو۔ ہاں ترکیب فارسی میں اخفائے نون ضروری ہے۔" (اصلاح اخترؔ) جناب ابرؔ احسنی کو لکھتے ہیں کہ:- "جبیں، آستیں، آسماں، جاں، گریباں سب بقاعدہ فارسی مضاف الیہ یا معطوف ہوں گے تو بالاخفا پڑھے جائیں گے۔ اور فغاں کسی حالت میں بھی بہ اظہار نون نہیں..... متذکرہ بالا الفاظ کو اگر مرکب نہ کیا جائے تو بحالتِ افراد بھی بالاخفار کہہ سکتے ہیں......"

(۷) بےکلی فصیح نہیں خصوصاً اس لئے کہ یہ عورتوں کا اندرونی مرض ہے۔ جو پہلوئے ذم رکھتا ہے۔ (اصلاح اخترؔ)

(۸) خدا مست (بمعنی مست مولا) اچھی ترکیب نہیں۔ (اصلاح اخترؔ)

(۹) کیسے بمعنی کیونکر داغؔ اور امیرؔ نہیں لکھتے۔ میں بھی نہیں لکھتا مگر اب اکثر لکھنے لگے ہیں۔ لہٰذا بخیال توسیع زبان رہنے دیا (اصلاح اخترؔ)
مطلب یہ ہے کہ ناسخؔ وغیرہ متوسطین تک کیسے بمعنی کیونکر لکھتے تھے۔ لیکن

متاخرین نے اس معنی میں ترک کر دیا تھا۔

(۱۰) اختر بریلوی کو حضرت احسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ ناراضگی بھی صحیح ہے۔ حال آنکہ "ناراض" سے "ناراضی" ہی بلفظہٖ بن سکتا ہے۔ "ناراضگی" نہیں بن سکتا۔ لیکن عموماً رائج ہے اس لئے صحیح بلکہ فصیح بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اب "ادائگی" بنا لیا گیا ہے۔ سر سیّد اس کی جگہ صرف ادا بولتے تھے جیسا کہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اُردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔"

(۱۱) پیرہن کے لیے پارہ پارہ ہونا (بجائے ٹکڑے ٹکڑے ہونا) فصیح ہے۔ (اصلاح منظر)

(۱۲) شب فرقت میں فصیح نہیں۔ صرف شبِ فرقت فصیح ہے۔" (اصلاح منظر)

(۱۳) زلف کے لیے "ترتیب دینا" اچھا نہیں معلوم ہوتا (اصلاح صغیر)

(۱۴) تم ہی کے بجائے تمھیں فصیح ہے (اصلاح ابر)

(۱۵) آدِ اشارہ مخاطب بعید کو اور آے مخاطب قریب کو چاہیے (اصلاح ابر)

(۱۶) دھو کے، پا کے وغیرہ بجائے دھو کر پا کر لکھنؤ کا ایجاد ہے۔ دلّی والے اس کو فصیح نہیں سمجھتے۔ (اصلاح راز)

(۱۷) عبداللطیف اعظمی کو لکھتے ہیں منحصر کو منفرد اور فضیل کو سفیل بولنے والے جہلا اور بازاری لوگ ہیں۔ اور اسی زمرہ میں وہ حرف شناس آجاتے ہیں جنھیں فن سے آگاہی نہیں۔ اور ادبی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کو عوام کہا جائے گا نہ عام۔ میرے نزدیک "غلط العام فصیحٌ" سے وہ اہلِ علم مراد ہیں جو مستند اور معتبر ہیں۔ اور وہ لوگ جو بوجہ ناواقفیت یا عدم توجہی فنِ تحقیق سے نابلد ہیں اُن کو عوام میں شامل کرنا چاہیے اور اُن کے لیے "غلط العام فصیحٌ" کے ساتھ یہ فقرہ بڑھانا چاہیے کہ "غلطُ العوامِ قبیحٌ"۔

(۱۸) محمد ریاض حسن خیالؔ شاگرد داغؔ کو "چل کارے" کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کے معنی "چل دور ہو۔ دھتکارے" ہیں۔ اور وہ غزل (جس میں یہ لفظ ہے) میری موجودگی میں (حضرتِ داغؔ نے) فرمائی تھی۔ اور میں نے اُسی وقت اس لفظ کو سن کر اجنبیت کا اظہار کیا تھا۔ مگر بوثوق کہا گیا کہ یہ دلی کی زبان ہے اور ہم بولتے ہیں۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ عورتوں کی زبان ہے۔ اور عام استعمال نہیں۔ بہرحال ہمارے لیے سند ہے۔ دو ایک لفظ اور بھی اُن کے استعمال میں تھے۔ اگر سوانح کی تکمیل ہوگئی تو انشاء اللہ ایسے الفاظ کے متعلق عرض کیا جائے گا۔"

(۱۹) بات کرنا اور کرنی کا فرق یاد رکھو۔ جب کسی مذکر لفظ کے بعد فعل آئے تو مذکر۔ اور جب مؤنث لفظ ہو تو اُس کا فعل مؤنث چاہیے۔ جیسے روٹی کھانی جان دینی وغیرہ۔ یہ زبان دہلی کی خصوصیت ہے۔ بات کرنا۔ روٹی کھانا لکھنؤ کا

روزمرہ ہے۔ اب اگرچہ وسعتِ زبان کے خیال سے دونوں روزمرے خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس لیے عام طور سے اس کا لحاظ اُٹھ گیا ہے۔ یہ بطورِ آگاہی لکھ دی ورنہ میں بات کرنا غلط نہیں سمجھتا۔" (خط بنام سید احسن صاحب)

(۲۰) "کیفیت کی دوسری یاے تحتانی مشدّد بھی جائز ہے اور بہ تخفیف بھی۔" (خط بنام ایم۔ احسنی)

(۲۱) پرِیدا فارسی لفظ ہے اور اس میں ہ نہیں ہے۔" (خط بنام ابر احسنی)

(۲۲) "ہنود کی جگہ اہلِ ہنود غلط ہے۔ صرف ہنود صحیح ہے۔ جیسے مسلم، نہ اہلِ مسلم۔" (خط بنام ابر احسنی)

(۲۳) سخن بفتح ثانی اور بضم ثانی دونوں صحیح و مستعمل ہیں۔ (خط بنام اختر بریلوی)

(۲۴) "افیون اور افیم دونوں صحیح ہیں۔ ایک فارسی اور دوسرا اردو، فجر بسکون اوسط ہے۔ مگر دلّی اور اُن کے معاصرین و متعاقبین شعرا ابتدا بول چال کے مطابق لکھ جاتے ہیں۔" (خط بنام اختر بریلوی)

(۲۵) ٹھنڈی گرمیاں تو اُردو محاورہ ہے جس کے معنی بے مزہ شوخیوں کے ہیں۔ ٹھنڈی آنچ میں نے نہیں سنا۔ (خط بنام صغیر احسنی)

(۲۶) قفلی ہر معنی میں صحیح ہے۔ یعنی قاف کے بعد ف ہونی چاہیے قلفی یعنی قاف کے بعد لام، یہ بازاری اور جہلا کا تلفظ ہے۔ جیسے یہ لوگ

فصیل کو سفیل بولتے ہیں۔ یہ زبان نہ صحیح اور نہ مستند۔ اور نہ اسے اُردو زبان کا لفظ کہا جائے گا۔" (خط بنام صفیر احسنی)

(۲۷) "اُردو میں اسرار بحالتِ واحد بھی مستعمل ہے۔ جیسے اس میں کیا اسرار ہے۔" (خط بنام صفیر احسنی)

(۲۸) "مِسّل *Missal* انگریزی لفظ ہے۔ اور وہ ایک کتاب ہوتی ہے جو گرجوں میں رہتی ہے۔ اور اس کا رواج قدیم ہے۔ ث سے لکھنا صحیح نہیں۔ اسی طرح ٹمٹم ...." (خط بنام صفیر احسنی)

(۲۹) "دائم اور مریض دونوں اسم فاعل ہیں۔ ان دونوں کا بقاعدۂ عربی (بہ ادخال الف لام) استعمال صحیح نہیں۔ دائم المرض، دائم الحبس، دائم الخمر صحیح ہے۔ ورنہ دونوں اسم فاعل اس طرح مرکب نہیں ہو سکتے۔" (خط بنام صفیر احسنی)

(۳۰) غالبؔ کی طرح (یادگار غالب) مولانا احسن بھی ذال کو عربی سمجھ کر فرماتے ہیں کہ "ذال فارسی حرف نہیں۔ لہٰذا گزارش، گذر وغیرہ کو زے سے لکھو، یہی میں لکھتا ہوں۔" (خط بنام صفیر احسنی) لیکن ذال دراصل قدیم فارسی میں بھی ہے۔ جیسے کاغذ فارسی لفظ ہے۔

(۳۱) "عربی میں طیّار اور تیار دونوں صحیح ہیں۔ میرے نزدیک طیّار اگر اپنے اصلی معنی (طائر) میں نہ بولا جائے تو ت سے لکھنا چاہیے۔"... (خط بنام صفیر احسنی)

(۳۲) "صنائع، بدائع، جائز، فائز، حائل۔ سائل۔ صنایع میں دراصل "ی" ہے۔ ہمزہ کوئی مستقل حرف نہیں۔ صرف تلفظ کے لیے ہمزہ لکھ دیا جاتا ہے۔ تاریخ میں اس کے عدد نہیں لیئے جاتے۔ اور گھائل اردو کا لفظ ہے محققین اس پہ ہمزہ نہیں لکھتے اور قائل وغیرہ کا قافیہ نہیں کرتے۔ بلکہ اڑیل۔ کھڑیل کی طرح "یل" کو حرفِ نسبت سمجھتے ہیں۔" (خط بنام صغیر احسنی)

(۳۳) "ملزم ...... ازروئے قواعد ولغت بفتحہ زائے معجمہ چاہیے۔ مگر عام بول چال میں مجرم کا ہم وزن وہم معنی ہے۔ میرے نزدیک توسیع اُردو کے خیال سے یہ استعمال جائز ہے......"

(۳۴) حفظ ما تقدم۔ [1] دال مشدد مفتوح صحیح ہے۔

(۳۵) نظر کی جمع (نظریں) بسکون ظا فصیح ہے۔ حرکت بسکون رائے مہملہ بھی صحیح ہے۔

(۳۶) "سدا کا لفظ قطعاً متروک نہیں۔ ورنہ سدا سہاگن، سدا بہار جیسے الفاظ متروک ہو جائیں گے۔ جو یقیناً نہیں۔ حادثہ کی جمع حوادث ہے۔ جمع الجمع حوادثات محتاط نہیں لکھتے۔" (خط بنام اعجاز صدیقی)

اب بعض عام اغلاط کے متعلق حضرت احسن کا قول دیکھیے۔ "آج کل مع کے بجائے بمعہ۔ موقع کے بجائے موقعہ لکھتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اسی طرح "نہ یہ کام

[1] اردو میں رائج ہے۔ گو کہ "تقدم بالحفظ" بہتر ہوتا۔

کیا نہ ہی وہ" اس جملہ میں ہی کی ضرورت نہیں ہے۔ چند ایک میں ایک نہ لکھیں۔ اژدحام کو اژدحام لکھیں۔ فی زمانہ نہیں فی زمانہ چاہیئے۔ سینکڑوں، جھوٹ، سوبچ میں نون نہیں چاہیئے۔ لااُبالی میں الف کی جگہ واؤ غلط ہے۔ فطرۃً، قدرۃً، ضرورۃً، دفعۃً، مقابلتہً، لسنبتہً، معنیً وغیرہ کے آخر میں الف نہیں چاہیئے تینوں، چاروں وغیرہ کے آخر میں نون لکھتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ دونوں کے آخر میں نون نہیں لکھتے۔ لکھنا چاہیئے۔ بعض لوگ قرآن پاک کی عبارت یتیماً وّ اسیراً سے اُردو میں یتیم دلیسیر لکھنے لگے ہیں۔ لیسیر کو یتیم کا مترادف سمجھنا غلط ہے۔ لیسیر کے معنی قلیل کے ہیں۔ اسی طرح وجیہہ کا مترادف شکیل نہیں ہے (ماخوذ از رسالہ فصیح الملک اگست سنہ ۱۹۰۵ء)

(۲) اب کچھ ایسے الفاظ بھی دیکھیئے جن کی تذکیر و تانیث حضرت احسن نے بڑی خوبی کے ساتھ سمجھائی ہے۔ اور لکھنؤ و دہلی کے اختلافات پر مطلق زور نہیں دیا۔

(۱) حضرت داغ کے شاگرد متین مچھلی شہری کو لکھتے ہیں کہ ٹمٹما میری سماعت میں یکسر ہر دو تائے ہندی لکھا ہے۔ لغت دیکھنے سے بھی دہلی اور لکھنؤ میں یہی استعمال ہوا۔ ممکن ہے کہ پنجاب اور پورب میں بفتح بولتے ہوں"

(۲) حضرت اختر نگینوی کو لکھتے ہیں۔ وادی زبان فصحا پر تو یقیناً مذکر ہے۔ فرہنگ آصفیہ نے بحالت مفرد مؤنث اور وادی ایمن کو مذکر لکھا ہے۔

مگر اس کی یہ تحقیق اہلِ نظر کی نگاہ میں وقیع نہیں۔ شعرائے لکھنؤ میں متفق علیہ مذکر ہے۔

صبا کا مصرع ۔ ع خاک میں مل گیا سب وادیِ ایمن کیسا

نوازش شاگردِ رند لکھتے ہیں۔ سہ

دل کو کس وقت خیالِ رخِ روشن نہ ہوا ہم سے وحشت میں جدا وادیِ ایمن نہ ہوا

میری سماعت اور زبان پر بھی مذکر ہے۔ موجودہ بول چال میں ایجاد (مذکر) اصطلاح (مؤنث) برف (مؤنث) فہم (مذکر) وغیرہ کی طرح یہ لفظ بھی غلط طریقے سے مستعمل ہے۔

(۲) "اختر بریلوی لکھتے ہیں۔ بول کو ناسخ نے مونث لکھا ہے۔ سہ

دل کو خوش آتی ہیں صحرا کی ببولیں پُر خار اب کسی سروِ گل اندام سے کچھ کام نہیں

مگر ہماری زبان پر مذکر ہے۔ اور فرہنگ آصفیہ نے بھی مذکر لکھا ہے ...."

(۳) "اُفق" مذکر ہے۔ نوازش کا مصرع ہے۔

ع ۔ افقِ چرخ بھی ڈوبا ہوا آتا ہے نظر

پتنگ (مہر معنی میں) مذکر ہے۔ (خط بنام اختر بریلوی)

(۴) حضرت فصاحت جالندھری کو لکھتے ہیں۔ ادرک اور کھیل بر وزن ہیل دونوں مونث ہیں۔ میر کا شعر ہے سہ

کیا کہوں مرچ تھی نہ ادرک تھی اُس مچھندر میں کچھ بھی بھدرک تھی

جس لفظ کی جمع "ین" سے مستعمل ہو وہ لفظ یقیناً مونث ہو گا۔

مذکر مفرد کو کبھی "ین" سے نہیں بولا جاتا۔

(۵) نقاب مختلف فیہ ہے۔ میں مؤنث لکھتا ہوں۔ اور اب بکثرت یہی استعمال جاری ہے۔ نشاط بھی مونث ہے۔ اور میں مونث لکھتا ہوں۔ موجودہ زمانے کے اہل قلم ان پابندیوں کے عادی نہیں، جن کا التزام پرانی لکیر کے فقیر کیا کرتے تھے۔" (خط بنام صغیر احسنی)

(۷) متاع کو بعض نے مذکر لکھا ہے۔ مگر مستند اور مستقل مونث ہی۔ میں بھی مونث لکھتا ہوں۔ بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں۔

بلا غارت گری آتی ہے ظالم تیرے غمزے کو
متاعِ صبر و طاقت سب ہی اک پل میں غارت کی

لیکن نسیم نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

تھا متاعِ عمر جو وقفِ بیاباں ہو گیا
کی گہر ریزی ہمارے آبلوں نے لوٹ کر

(خط بنام صغیر احسنی)

۱۹۲۹ء میں راز چاندپوری کو لکھتے ہیں کہ "تقریباً پچیس برس ہوئے کہ انجمن ترقیِ اُردو کے سکریٹری صاحب نے ایسی جمع کے متعلق بذریعہ خطوط، خاص خاص لوگوں سے مشورت چاہی تھی۔ چنانچہ مجھے بھی اسی خصوص میں لکھنا پڑا۔ اور وہ نجی تحریریں ریاض الاخبار اور مشرق (بادارت حکیم برہم گورکھپوری مرحوم) کے ذریعہ سے معرضِ بحث میں آئیں۔ اہلِ لکھنؤ یہ فرماتے ہیں کہ جب

غیر ذی روح مفرد لفظ کی جمع بقاعدۂ عربی مستعمل ہو وہ بحالتِ جمع مذکر ہونی چاہیئے۔ مثلاً کتاب سے کُتُب۔ کیفیت سے کیفیات۔ خدمت سے خدمات۔ اس میں مفرد کے مذکر و مونث کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا۔ مگر اہلِ دہلی کا استعمال اکثر اس کے خلاف ہے۔ میں نے اُس وقت بھی عرض کیا تھا کہ اس کے لیئے یہ اصول قرار دینا چاہیے کہ بحالتِ انفراد جو لفظ مونث ہو اُس کی جمع بھی مونث ہو۔ اور جو لفظ مفرد مذکر ہو اُس کی جمع بھی مذکر ہو۔ اس اصول میں جو آسانی ہے ظاہر ہے .... ورنہ اُن کے قاعدے کے مطابق عورت (خواہ اُردو معنی میں سہی) کو عورات کرنے کے بعد مذکر کہیے۔ ممکن ہے اس قاعدۂ کلیہ کے بعد دو چار لفظ ایسے مل جائیں جن کے واحد و جمع میں اختلاف ہو اور زبانوں پر جاری ہوں۔ لیکن اکثر کلیوں میں استثنار ہوتا ہے۔ وہی مانا جائے گا۔ میں وجوہ کو مذکر نہ لکھوں گا۔ اگرچہ اہلِ قلم لکھتے ہیں۔"

اسی طرح حضرت احسنؔ نے فصیح الملک (اپریل سنہ ۱۹۰۶ء میں بحث کی تھی، کہ خط لکھنا چاہیئے، کتاب پڑھنی چاہیے۔ کتابیں چاہئیں۔ مکانات ڈھونڈنے چاہئیں ہی دلّی والوں کے نزدیک صحیح ہے۔

اِن کے علاوہ حضرت احسنؔ کے کچھ نکات املاء کے متعلق بھی ہیں، جن کی تفصیل علیگڑھ میگزین کے احسنؔ نمبر میں دی جا چکی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ انجمن ترقیِ اُردو کی موجودہ املاء میں

اکثر و بیشتر اصول حضرت احسن کے نظر آتے ہیں۔ بہر حال اجمالاً عرض کیا جاتا ہے۔

(۱) جب یائے ساکن کے پہلے زبر ہو تو وہ بی نصف دائرے کی بنائی جائے۔ مثلاً ہے، شے، مے، نے، طے۔

(۲) نون جب پورا پڑھا جائے تو نقطہ لگایا جائے اگر صرف اخفا ہے تو نقطہ نہ لگایا جائے۔ اور اگر درمیان میں ایسا نون آئے تو الٹا جزم لگا دیا جائے۔ مثلاً تانبا، ہنسی وغیرہ۔

(۳) ہائے مخلوطی ہمیشہ دو چشمی لکھی جائے۔

(۴) ہندی الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی لکھنا غلط ہے۔ پتہ،[1] کلیجہ، مہینہ، ٹھیکہ، بھروسہ وغیرہ کے آخر میں ہ غلط ہے۔ الف چاہیے۔

(۵) حالتِ جار، حالتِ اضافت و عطف میں بھی الفاظ اسی طرح لکھے جائیں جس طرح بولے جاتے ہیں۔ مثلاً اس بارے میں۔ "اس زمانے میں" اس مشاعرے کا، لب و لہجے۔ اہلِ زبان، شایانِ شان وغیرہ۔

(۶) مرکب الفاظ کے اجزا ہمیشہ علیحدہ علیحدہ لکھے جائیں جیسے چوں کہ، چناں چہ، کیوں کہ، حال آں کہ، بل کہ وغیرہ۔ اسی طرح افعال میں اجزا الگ الگ ہوں۔ جیسے آئیں گے، لکھوں گا، لکھ سکے گا۔ دے دیا ہے وغیرہ۔

---

[1] اس پر اورنگ زیب نے سب سے پہلے توجہ کی تھی۔ پھر انشا نے دریائے لطافت میں بحث کی تھی۔

(۷) کیجیے، لیجیے، اس لیے وغیرہ میں ہمزہ نہیں لکھتے بل کہ انشا کی طرح دو تی لکھتے تھے:

حضرت اختر نگینوی کو لکھتے ہیں کہ: "دیکھیے کے ۵۹ عدد ٹھیک ہیں۔ تاریخ میں مکتوبی عدد لیے جاتے ہیں۔ دیکھیے میں کھ کے بعد دو یاے تحتانی تلفظاً بھی ہیں اور تحریراً بھی۔ لہٰذا اس کو جائز سمجھیے۔ ناواقف ایک یاے تحتانی سمجھتے ہیں۔ اُن کی غلطی ہے۔"

اسی طرح حضرت احسن ذرا کو ذال ہی سے لکھتے تھے۔ اب اس کو زے سے لکھا جاتا ہے، اس دلیل پر کہ ذرّہ اپنے معنی اور تلفظ میں بدل گیا ہے۔ اسی کے خلاف حضرت احسن نے رسالہ فصیح الملک میں بحث کی تھی اور کچھ عربی الفاظ ایسے بھی پیش کیے تھے جو اپنی اصلی شکل میں اب بھی لکھے جاتے ہیں۔ گو کہ تلفظ اور معنی میں بدل چکے ہیں۔

اسی طرح "ٹھہرنا" کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں ٹھ ہندی کا (مخلوط ہ) حرف ہے..... اسی بنا پر پرانی زبان میں "ٹھیرنا" یاے تحتانی سے بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔" (خط بنام اعجاز صدیقی)

ان کے علاوہ فنِ عروض کے متعلق بھی بہت سے نکات حضرت احسن کی تحریروں میں ملتے ہیں جس کو بخوف طوالت فی الحال یہاں نہیں لکھا جاتا۔ تاہم مذکورۂ بالا باتیں ایسی ہیں جن کی اہمیت کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں

جنھوں نے زبان کی اصلاح پر خصوصیت کے ساتھ توجہ فرمائی ہو - اور ایک کامل استاد سے عرصہ دراز تک استفادہ کیا ہو.

غنچۂ شاہی[۱]

غنچۂ شاہی عجیب وغریب تخلص ہے ایک فارسی شاعر کا جس کے نادر کلام کے چند اوراق مجھے مولانا راشد برہان پوری کے کتب خانے سے حاصل ہوئے ہیں۔ اس شاعر کا ذکر انڈیا آفس اور ریو (Rieu) کی فہرستوں میں، یا تذکرۂ روزِ روشن اور دیگر بھوپالی تذکروں میں کہیں نہیں ملتا۔ لیکن لفظ "شاہی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق احمد آباد گجرات سے ہوگا۔ کیونکہ وہاں کے بزرگوں کی کئی کتابوں میں حضرت شاہ عالم رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء) کی نسبت سے یہ لفظ نام کا جزو بن گیا ہے۔ مثلاً جمعات شاہی (از حضرت شاہ عالم رح) روضاتِ شاہی (از سید جعفر بدر عالم رح) لطائفِ شاہی (از سید محمد مقبول عالم)

---

[۱] معارف (اعظم گڑھ) بابت فروری ۱۹۵۳ء۔

حکایتِ شاہی (از شیخ سراج رح) وغیرہ شاعر کے کلام میں اسی سلسلے کے بزرگ ماہ جیو کا ذکر بار بار آتا ہے۔ مثلاً:

شاہ عالم ماہ جیو در محبت ما افزوں شدہ	صبغت اللہ بہر بالائے ردا موزوں شدہ
خاک پائے ماہ جیو را طوطیا سازم بچشم	اے مسلماناں دوائے دردِ بے درماں کنید
ماہ جیو شاہ سازم تختِ او بر سر کنم	دیدہ را در پائے او مالم قدش راز رکنم

۱ "جیو" کئی بزرگ کے نام کے ساتھ آتا ہے، تذکرہ اولیاے دکن (عبدالجبار ملکاپوری) کے صفحہ ۲۲۷ میں شہر مانڈو کے شاہ "میاں جیو" (المتوفی ۹۰۸ھ) اور ص ۳۵ میں برہان پور کے شیخ ابو جیو تمیمی (المتوفی سنہ ۹۹۲ھ) کا ذکر آتا ہے۔ لیکن جیو کسی خاص صوبہ کی زبان پر نہ تھا، بلکہ عام طور پر جی کی جگہ بولا جاتا تھا۔ انشا نے اپنے کلیات مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۶ء میں شیخ جی کی جہاں جہاں خبر لی ہے وہاں شیخ جیو ہی لکھا ہے۔ مثلاً:

عالم تزویر میں ہے شیخ جیو صاحب کی ذات	مقتدای مرشد عالی جناب عنکبوت (ص ۳۹)
بتاتے ہیں ہم تم کو کیا شیخ جیو	ذرا آنے دیجے تو ہولی کی رت (ص ۳)
گرے جو وجد سے عشرت کے شیخ جیو تو لگی	کمالِ شانہ ملا ابو الفراغ کی چوٹ (ص ۳۹)

(حاشیہ صفحہ ۲۲۷ پیشگی دیا گیا) حضرت ماہ عالم رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال بخاری رحمۃ اللہ علیہ (سنہ ۱۳۸۴ء) سے ملتا ہے۔ یعنی حضرت شاہ عالم رحمۃ اللہ علیہ ابن حضرت عبداللہ قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ ابن حضرت جہانیاں جہاں گشت رح۔

یہ "شاہ جیو" حضرت سید جلال الدین ابو محمد شاہ عالم رحمۃ اللہ علیہ (سنہ ۹۵۹ھ تا سنہ ۱۰۰۳ھ) معلوم ہوتے ہیں۔ جن کا ذکر خاتمۂ مرأۃ احمدی (مرتبہ پروفیسر نواب علی ص ۴۰-۴۱)[1] میں اس طرح ملتا ہے:-

"سید جلال الدین ابو محمد شاہ عالم،

سید جلال الدین ابن سید حسن ابن سید احمد عبد الغفور ابن سید احمد ابن سید راجو ابن حضرت شاہ عالم ولادت ایشان ششم ذیقعدہ سال نہ صد و پنجاہ و نہ ہست، والدۂ ایشان خوندا گوہر بنت ملک خضر بود، ذات متبرک ایشان بعد مرور زمان واسطۂ انتظام و رابطہ والتیام سلسلۂ عالیہ شاہیہ و باعث رونق ایں خانوادہ شدہ و بعد انقلاب بسیار سال تسخیر اکبر بادشاہ شہر احمد آباد بہ سعی خان اعظم نائب شہر سجادگی آستانہ علیہ شاہیہ بر ایشان مقرر شد، ایشان مرید و خلیفۂ حضرت میر محمد ابن احمد ابن سید عرب شاہ ابن حضرت سید راجو قدس سرہم بودند۔ و طریقۂ سلوک پیش ایشان باتمام رسانیدہ بودند۔ و درس از میاں وجیہ الدین مولوی ہم گرفتہ اند، و خوارق عادات ازاں حضرت بسیار مذکور و منقول اند ...."

---

[1] حاشیہ صفحہ ۲۲۶ پر ملاحظہ ہو۔

آوردہ اند کہ روزے سید ابوتراب شیرازی ضیافت کردہ
بودند۔ چنانچہ اکثر بزرگان مدعو بودند۔ سید جلال ہم تشریف
فرمودند، چوں ایام سرما بود، ہمہ زمستانی پوشیدہ آمدند۔
ایشاں زمستانی خود را بہ سائلے عنایت فرمودہ با پیراہن
یک لا در مجلس تشریف بردند چوں ہوا بغایت سرد بود، سید
امین محمد وزیر خاصِ سید جلال را صاحبِ ضیافت بطریقِ
کنایت گفتند کہ دو شالہ برائے سید بیارید کہ ہوا بغایت سرد
است، سید امین محمد از مجلس بر آمدہ متحیر ماندند کہ دو شالہ
از کجا بیارند۔ در سرکارِ خود بالفعل حاضر نیست، دریں اثناء
یکے از مریدان پیش سید محمد امین آمد، و دو شالہ آوردہ
گفت ایں را برائے سید نیاز آوردہ ام، و از دیر ایستادہ ام
سید محمد امین آوردہ بر حضرت پوشانیدند، و بعد انقضاء
ماجرا را نقل کردند، ہمت و سخاوت فطری و جود جبلی بمرتبہ بود
کہ در تحریر نگنجد از بس سخاوتِ ظروف و لباس در خانہ نمی ماند
نصف شب چہاردہم ذی قعدہ بعد از سہ سال بر ہزار وصالِ
آں حضرت شد، و لوزا از جہان رفت، افصاح سالِ وصال
می کنند۔ قبر (سنہ) پایانِ گنبدِ شاہی در جلی علاحدہ واقع است (۱)۔

(حاشیہ صفحہ ۲۲۹ پر)

شاعر کے کلام میں گجرات کے ایک بزرگ "میر عرب" کا ذکر بھی آتا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا نام بعد میں کسی مرتب نے شامل کیا ہے۔ کیونکہ خاتمہ مرأۃ احمدی (مرتبہ پروفیسر نواب علی ص ۸۰-۸۱) میں حضرت شیخ محی الدین ابو یوسف یحییٰ چشتی رح ابن شیخ محمود بن شیخ محمد چشتی رح کے سلسلے میں میر عرب کا ذکر اس طرح آتا ہے :-

"حضرت شیخ را میل طرف مولود و سرود و سماع بسیار بود، چنانچہ معمولِ خاندانِ چشتیہ است در اعراس و مجالس بزرگان ہمیشہ مولود و سرود بہ عزا میسر می شد، چوں تقید پادشاہ (اورنگ زیب) دریں امور بسیار بود، بنابریں میرزا باقر محتسب از ہمہ مولود خوانان و سرود گویان محلکہ گرفتہ کہ ہیچ جا مولود نخوانند و سرود نگویند، و ایں معنی دراں وقت از ہمہ جا موقوف شدہ مگر در خانقاہ شیخ کہ ہمیشہ مولود می شد، ایں معنی بر محتسب و مردمان دیگر بسیار شاق می آمد۔ چنانچہ یک روز محتسب قرار کردہ کہ مولود خوانان را از خانقاہ شیخ گرفتہ بیارد و تنبیہ و تادیب نماید

(حاشیہ صفحہ ۲۲۸) سلہ غالباً یہ مقام کسی اونچے ٹیلے پر واقع ہے، کیونکہ غنچہ شاہی نے ایک جگہ کہا ہے :- بر سر کوہ عجب بارگہے می بینم کوہ طور است مگر موسی عمران ایں جا ست

به ارادهٔ فاسد آمده بخانهٔ میر عرب نشست، چوں ایں خبر بشیخ رسید ایشاں مریدان خود را فرمودند که همه مستعد و مسلح نشینند۔ اگر محتسب ارادهٔ ایں طرف نماید، بزنند، و خود هم نیمچه گرفته نشستند، چوں ایں خبر به میر عرب و محتسب رسید میر عرب گفت من اول رفته شیخ را بفهمانم، اگر قبول کنند فبها والّا شما دانید و کارِ شما۔ چنانچه میر عرب بخدمت شیخ آمده اظهار کردند که محتسب به ایں اراده آمده ست، لهٰذا بهتر آن ست که چند روز ایں امر موقوف باشد، و حکم بادشاه طلبیده اجرا خواهند فرمود، شیخ از استماع ایں معنی بسیار برهم شده فرمودند، کیست بادشاه؟ منم هر کرا می خواهم بر تخت می نشانم۔ برو محتسب را بگو که زود بیاید۔ میر عرب برخاسته آمد و ماجرا پیش محتسب اظهار نمود، و گفت الحال ایں معنی پیش رفت نخواهد شد و هنگام عظیم برپا خواهد گردید۔ مصلحت آن است که بر وقت دیگر موقوف باید داشت، چوں محتسب هم دانست که پیش رفت نخواهد شد، برخاسته بخانهٔ خود آمد۔ شیخ ایں ماجرا چند بار نوشته پیش بادشاه بمعرفت شیخ عبد الله پسر شیخ نظام فرستاده، اما عبد الله

مذکور را از راہگذر ساخت مدعیان شیخ خطوط بپادشاہ نرسانید،
آخر شیخ خطوط بمعرفت میر سید علی رضوی خان فرستادہ،
الشان بخدمت پادشاہ گذرانیدند، پادشاہ خط را بوسہ داد
بر سر گذاشتہ معذرت بسیار نوشت و چہار مراسلات حسب الحکم
یکے بنام راجہ جسونت سنگھ کہ دراں وقت ناظم این جا بود، و
یکے بنام نظام الدین احمد کہ دیوان بود و یکے بنام میر بہاء الدین و یکے
بنام قاضی محمد شریف فرستادہ کہ میرزا باقر محتسب را بتاکید
تمام منع نمایند کہ بارِ دیگر گرد ایں افعال نہ گردد، و در مسئلہ مختلف
فیہ احتساب نہ نمایند۔ و ہر چہار بخدمت شیخ رفتہ معذرت این
امر از طرف ما نمایند و یکہزار روپیہ و چہار تولہ عطر بخدمت شیخ
بگذارند۔ چنانچہ ہر چہار شخص بموجب حکم پادشاہ محتسب را زجر
و منع نمودہ بخدمت شیخ آمدہ معذرت کردند و مرسولہ پادشاہ
گذرانیدند، بعد ازاں ہیچ کس برائے مولود و سماع مزاحم
ہیچ کس نہ شد۔"

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر عرب کا اثر کسی حد تک حکام پر بھی تھا۔ اور اُس زمانہ کے اہل اللہ سے بھی اُن کا تعلق تھا، لیکن یہ بزرگ ہمارے شاعر کے بعد ہوئے ہیں، اُن کی تاریخ وفات جو مخطوطۂ اعراس نامہ

(مملوکہ جناب قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی) میں ملتی ہے۔ وہ اُردو کے مشہور شاعر ولی گجراتی کے ایک عزیز شاہ یحییٰ کی لکھی ہوئی ہے۔ اور وہ اس طرح ہے :۔

"میر عرب قادری تاریخہ از شاہ یحییٰ :۔

بے مثل بود میر عرب سنہ ۱۱۱۶ھ (۲۷ شوال المکرم)"

میر عرب احمد آبادی گجراتی کے متعلق تفصیل کسی اور جگہ نہ مل سکی۔ لیکن اس تاریخ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ غنچۂ شاہی[1] کا زمانہ میر عرب قادری سے پہلے رہا ہوگا۔ کیونکہ مقدم الذکر کے ممدوح حضرت ماہ عالم رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال میر عرب سے ۱۱۳ سال پہلے یعنی سنہ ۱۰۰۳ھ میں ہوا تھا۔ اور شاعر کے کلام کی ترتیب سے بھی کچھ اسی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ مرتب نے یوں لکھا ہے :۔

غنچۂ شاہی فرماید :۔

دیدۂ چرخِ فلک را خارمی باید کشید
دردِ دل را از برائے یارمی باید کشید

در جواب

تیر زہر آلود در منقار می باید کشید
عاشقانِ بوالہوس را دار می باید کشید

---

[1] حضرت ماہ عالم کا انتقال سنہ ۱۰۰۳ھ میں ہوا، غنچۂ شاہی کا ایک شعر ہے :۔

ماہ جیو را من دہم خطِ غلامی بر علا
صاحب من ماہ جیو در جنت الماویٰ شدہ

اس شعر سے ظاہر ہے کہ شاعر کی زندگی میں حضرت ماہ عالم نے وفات پائی تھی لیکن شاعر کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں۔

ولہٗ جواب :-

سرمہ را اندر دو چشم یار می باید کشید
زخم را از دستِ آں غمخوار می باید کشید

ولہٗ جواب

دیدہ را ہر دم بزلفِ یار می باید کشید
در تماشا منت از دلدار می باید کشید

ولہٗ جواب

زخمِ خنجر از نگاہِ یار می باید کشید
از وجودِ خویشتن انکار می باید کشید

جواب میر عرب :-

رشتہ ہائے جانِ خود را تار می باید کشید
مہرۂ تسبیح را زنار می باید کشید

دست را از قالبِ جاں نہ گذر از جانِ خود
مردہ را گر زندہ سازد یار می باید کشید

یہاں "غنچۂ شاہی فرماید" اور اُس کے بعد "جواب میر عرب" (جو شاہ کے اشعار کے جواب میں ہے) سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ عرب پہلے گذرا ہے، جس کے جواب میں میر عرب نے یہ دو شعر لکھے ہوں گے۔ اس کے باقی اشعار بعد میں آئیں گے۔

کلام میں ایک غزل "مرزا منظفرؔ" سے بھی متعلق ہے، اور وہ اس طرح ہے :-

تعریف مرزا منظفر

یک دو سہ تیرے بخدمت شد رواں از دستِ شمع
روز و شب در غم ازاں اند بلبلاں از دستِ شمع

گر دہی رو زرے شکار را ز بہرِ آہوئے نگار
از نگاہت داغ کردند آہواں از دستِ شمع

شمعِ رخسارِ ترا بینند و جاں قرباں کنند
شربتِ تیرِ ترا نوشند بجاں از دستِ شمع

آہوئی چیں را فتد آخر گذر با تو نظر
نافہ در زوم افگندای دلستاں از دستِ شمع

آہواں لب تشنہ بُریت شدہ در کوہ و دشت | ماہیاں در کربلا دار دفغاں از دستِ شمع
غنچہ شاہی بہت دایم در فراقِ آہواں | شد کباب آخر مظفر در جہاں از دستِ شمع

یہ مرزا مظفر کون تھے؟ تیقن کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا، یوں تو ایک مشہور مرزا مظفر اکبر کے داماد تھے جن سے سکینہ منسوب تھیں۔ اور جن کا تعلق دکن سے تھا۔ یہ وہی مظفر تھے جن کو برہان پور کے راجہ علی خاں فاروقی نے گرفتار کر کے اکبر کے پاس بھیجا تھا۔ لیکن شاعر کے کلام میں کوئی اور چیز ایسی نہیں ملتی جس سے ثابت ہو سکے کہ یہ وہی مظفر تھے[۱]۔

شاعر کے کلام میں متعدد مقامات پر حضرت شاہ عالم رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے خاندان والوں سے عقیدت کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اور اس شاعر کے کلام میں صرف یہی خوبی ہے، ورنہ فن کے لحاظ سے اُس کی شاعری بہت خام ہے اور وہ عروض میں عوام کے تلفظ کا تابع نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک غزل کی ردیف میں "سلام علیک" ہے جو مفاعیلن کے وزن پر ہے۔

روئے تو ہمہ گلگوں اے یار سلام علیک | زلفِ تو ہمہ مفتوں اے یار سلام علیک
راہ تو ہمہ سیحوں عشق تو ہمہ جیحوں | ہر روز منم در خوں اے یار سلام علیک

---

[۱] اکبری عہد کے سلطان مظفر یا مظفر بادشاہ کا ذکر خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۸۵ میں اس طرح آتا ہے کہ اُس نے اکبر کے ملازمین سے احمد آباد چھین لیا تھا، لیکن غیبن شاہ مجذوب کی بد دعا سے اُسے شکست ہوئی اور مارا گیا۔

نامِ تو ہمہ زوں ستار تو ئی بیچوں | با نامِ تو ما مجنوں اے یار سلام علیک
اے شاہ تو ئی ذوالنول ہستی ہمہ جا ہاموں | عالم ہمہ شد پُر خوں اے یار سلام علیک
اے طالع تو میموں فرماں بہ تو مخزدں | جانہا ہمہ در گردوں اے یار سلام علیک
مارا نہ کنی بیچوں از در گمہ خود بیروں | ہستیم بجاں مجنوں اے یار سلام علیک
ہر روز تو ئی میگوں اے شاہ ہمہ مجنوں | شد غنچۂ شاہی تو وں اے یار سلام علیک

ایک موقع پر سلام پیش کرتا ہے، اس میں بھی کئی جگہ عروض کی پابندی نہیں ہے۔ مثلاً شعر ۳، ۴ میں۔

السّلام اے شاہ با جود و کرم | بر کفِ پایت بود فرقِ سرم
السّلام اے قبلۂ عالم پناہ | جایت اندر روضۂ بیت الحرم
السّلام اے حضرتِ والدہ جیو | خاکِ پایت را بہ دُر ہا می خرم
السّلام ہمشیرۂ دنیا و دیں | دستِ ما و دامنِ تو در حرم
السّلام اے ہم نشینِ فاطمہ رضؓ | آہ نومیدی کشتم ایں با درم
السّلام اے عمدۂ اہلِ لبشر | پاسبانت می شوم گر قیصرم
السّلام اے مشعلِ دنیا و دیں | لطف فرما د قدم نہ بر سرم
السّلام اے پادشاہ بحر و بر | مثلِ پروانہ بہ کو یت بر درم
السّلام اے فخر و تاجِ ما ہمہ | از غلامانِ درت من کمترم
السّلام اے محرمِ اسرارِ حق | تیر خذلاں را مزن اندہ بوم

السّلام اے من غلامت را غلام — کے بمانی تاج شاہی بر سرم

السّلام آئینۂ روے خدا — گر قبول افتد زجاں می پرورم

السّلام اے عیدیِ شاہِ عظام — من شدم قرباں زجاں قرباں ترم

السّلام اے قابلِ درگاہ حق — غنچۂ شاہی ہست اندر در حرم

چوتھے اور پانچویں شعر میں "ہمشیرۂ دنیا و دیں" اور "ہمنشین فاطمہ" سے اندازہ ہوتا ہے کہ ممدوحہ حضرت باوہ عالم رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی عزیزہ ہوں گی[1]

ایک دوسری غزل میں بھی اسی طرح ہے :-

اے محبّ چار یار ہمشیرۂ عالی کلام — من سگِ اصحاب کہفم خویش را بے سر کنم

قبلہ گاہا حضرتِ بی بی کلانت پیر ما — در قدم گاہِ سگانت خویش را کمتر کنم

"بی بی کلاں" کا نام اور حال مجھے کہیں نہ مل سکا اور شاعر کے کلام میں بھی صرف ان ہی مقامات پر آیا ہے۔

اس کے علاوہ کلام میں ایک اور چیز ملتی ہے۔ وہ یہ کہ شاعر کا تخلص غنچۂ شاہی کے علاوہ خدنگی بھی تھا۔ یہ تخلص صرف ایک ہی مقام پر آیا ہے۔

---

[1] خاتمۂ مرآۃ احمدی (ص ۴۰) میں حضرت ماہ عالم کی والدہ کا نام خواند گوہر بنت ملک خضر آتا ہے! اور ان کی اہلیہ کا نام (صفحہ ۴۲) آمنہ بنت سید نصر اللہ ملتا ہے۔ اس سلام میں لفظ ہمشیرہ خود "ہندوستانی" ہے۔ اور شاعر جس درجے کا ہے اس کا اندازہ ہر غزل سے ہوتا ہے۔ تاہم وہ کہتا ہے کہ

در ازل غنچۂ شاہی شد در ہند اسیر — دل ربا را تو ازیں گنبد ویراں مطلب

یعنی مجموعے کی پہلی غزل میں ہے، جس کے اوپر "کلام غنچۂ شاہی" لکھا ہوا ہے۔ وہ غزل یہ ہے :-

اے خداوندے کہ او دل نورِ ایماں آفرید
در شبِ تاریک بنگر ماہِ تاباں آفرید

نور را در صحنِ گردوں ساخت چوں قندیلِ زر
لعل از اں رخشندہ او در چرخِ تاباں آفرید

کردہ چوں بر آدمِ خاکی بصورت یک نظر
ہم بمعنی در تنِ خاکیِ او جاں آفرید

گفت ملائک را بدان شو آدمی را سجدہ کن
طوقِ لعنت در جہاں از بہر شیطاں آفرید

(کذا)
آدمِ بیچارہ را چوں از برائے گندمے
کرد بیرونش ز جنت بہرِ دہقاں آفرید

ہمچو یونسؑ در میانِ بطنِ ماہی جا داشت
از برائے نوح بنگر بادِ طوفاں آفرید

سوزنے را سدِ راہِ عیسیٰؑ مریم نہاد
در چہارم آسمانش بُردہ دہماں آفرید

ارہ را در فرقِ زکریائے پیغمبر نہاد
در تنِ ایوب مسکن بہرِ کرماں آفرید

کارد را در حلقِ اسماعیل پیغمبر فگند
از برائے ایں ترانہ عیدِ قرباں آفرید

(کذا)
اے خدنگی ہمچو بلبل نالہ ہائے زار کن
بلبلِ طبعِ ترا چوں در گلستاں آفرید

پس اسی غزل میں خدنگی تخلص آتا ہے۔ اس کے بعد بغیر کسی ترتیب کے اس شاعر کی غزلیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں متعدد عروضی خامیاں بھی ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ خامیاں کاتب کی غلط کتابت کی وجہ سے ہوں۔ کیونکہ جو نسخہ ہمارے پاس ہے وہ بہت بد خط اور بہت غلط ہے۔ بہر حال یہ کلام نایاب ہے[1]۔

---

[1] معارف (اعظم گڑھ۔ فروری ۱۹۶۲ء) میں غنچۂ شاہی کا بہت سا کلام دے دیا گیا ہے اور بیشتر طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا گیا ہے۔

حافظ کے قصیدے

خواجہ شمس الدین محمد ابن بہاء الدین حافظ کا مرتبہ فارسی شاعری میں بہت بلند ہے۔ لیکن وہ اپنی غزلوں کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں۔ اور خصوصاً شراب معرفت کے لیے ہمارے ملک میں سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ قصیدہ، مثنوی، قطعہ اور رباعی سب کچھ لکھا لیکن غزلیں ہی ان کی شہرت اور مقبولیت کا موجب بنیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر وہ غزلیں نہ لکھتے تو اُن کا کوئی مقام فارسی شاعری میں ہوتا بھی یا نہیں۔ آج ہم اسی چیز کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اور اُن کی غزلوں کے بجائے صرف قصیدے سے اُن کا مرتبہ متعین کریں گے۔

حافظ سے پہلے فارسی قصیدہ جن منزلوں سے گزر چکا تھا اُن کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔ تاکہ صحیح طور پر یہ معلوم ہو سکے کہ حافظ نے

اس صنف سخن میں کوئی اضافہ بھی کیا یا نہیں۔ اور اگر کیا ہے تو وہ ادبی لحاظ سے کس قدر اہم ہے؟

فارسی شعراء میں سب سے پہلے رودکی (م ۳۲۹ھ) کا قصیدہ ملتا ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

مادرے را بکرد باید قربان

بچۂ او را گرفت و کرد بزندان

یہ چورانوے اشعار کا قصیدہ ہے جو تاریخ سیستان میں منقول ہے۔ اس قصیدے میں ممدوح کے انعامات و احسانات کو سادہ طریقہ پر بیان کر دیا ہے۔ تکلف اور تصنع بہت کم ہے۔ لیکن تشبیب، اصل مدح، دعائیہ وغیرہ تمام چیزیں موجود ہیں۔ پھر دقیقی طوسی (م ۳۴۱ھ) کے قصیدوں کا ثبوت بھی ملتا ہے اور محمد عوفی کی لباب الالباب میں سامانی عہد کے متعدد شعراء کے قصائد کے اشعار ملتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اچھی اچھی تشبیہات و استعارات کا رواج ہونے لگا تھا۔ اس کے بعد عہد آل سبکتگین میں دور از کار تشبیہات شروع ہوئیں۔ لیکن فرخی کے یہاں سلاست و روانی، صنایع و بدایع کا برمحل استعمال اور واقعہ نگاری خاص چیزیں ہیں۔ پھر منوچہری کے یہاں زمانۂ جاہلیت کے عربی قصیدوں کے تمام لوازم پائے جاتے ہیں۔ بسید حسن غزنوی (المتوفی ۵۵۶ھ) کے یہاں واقعہ نگاری بہاریہ تمہید اور پر شکوہ الفاظ کے علاوہ نئی نئی تمہیدیں ملتی ہیں جو بعد میں انوری کے

یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ پھر جمال اصفہانی، خاقانی شروانی اور کمال اسمٰعیل نے قصیدے کو جس معراج پر پہنچایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور ان جیسے قصیدے سوائے قاآنی کے اور کسی شاعر کے قلم سے نہیں نکلے۔ بہر حال قصیدہ گوئی کے اس مختصر جائزے سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ خواجہ حافظ سے پہلے فارسی قصیدہ کس حد تک عربی قصیدے سے متاثر تھا: اور اس میں کیا کیا لوازمات پائے جاتے تھے۔

حافظ نے چند ہی قصیدے لکھے لیکن وہ سب کے سب اپنی ادبیت کے لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک قصیدہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں ملتا ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

مقدرے کہ ز آثار صنع کرد اظہار

سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار

لیکن اس قصیدے کے بعض اشعار میرے نزدیک الحاقی ہیں۔ کیونکہ حافظ کے مشرب سے مختلف ہیں۔ اس قصیدے کے علاوہ چند قدیم قصیدوں میں سے ایک قصیدہ شیخ ابو اسحاق انجو کی مدح میں ہے۔ یہ شخص غازان خاں کے عہد میں فارس کا گورنر تھا۔ اس نے ۷۴۳ھ میں شیراز پر قبضہ کیا اور قریب دس سال تک وہاں اس کا تسلط قائم رہا۔ پھر مبارز الدین محمد ابن مظفر سے شکست کھا کر اصفہان کی طرف چلا گیا۔ غرض اسی دس سال کی مدت میں

کسی وقت حافظ نے یہ قصیدہ اُس کی مدح میں لکھا تھا۔ اور زمین وہی اختیار کی ہے جو سید حسن غزنوی کے یہاں خاص اہمیت رکھتی ہے یعنی :۔

سپیدہ دم کہ صبا بوئے بوستاں گیرد چمن ز لطفِ ہوا نکتہ بر جناں گیرد

یہ قصیدہ بہاریہ ہے اور بڑے لطیف انداز میں ہے۔ پُرشکوہ الفاظ اور نادر تشبیہات و استعارات دیکھنے کے لائق ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

ہوا ز نکہتِ گل در چمن تتق بندد افق ز عکسِ فلق رنگ گلستاں گیرد

نوائے چنگ بداں ساں زند صلائے صبوح کہ پیرِ صومعہ راہِ درِ مغاں گیرد

شہ سپہر چو زریں سپر کشید بہ سر بہ تیغ صبح و عمود افق جہاں گیرد

بہ رغم زاغِ سیہ، شاہبازِ زریں بال دریں مقرنسِ زنگار آشیاں گیرد

بہ بزم گاہِ چمن رو کہ خوش تماشائیست چو لالہ کاسۂ زرینِ ارغواں گیرد

صبا نگر کہ دمادم چو رند شاہد باز گہے لبِ گل و گہہ زلفِ ضیمراں گیرد

اِن لطیف و نادر تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ پُرشکوہ الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے اور ساتھ ہی برجستگی اور روانی بھی دیکھیے :۔

چو شہسوارِ فلک بنگرد بجام صبوح کہ خود بہ شعشعۂ آں مہر خاوراں گیرد

ز اتحادِ ہیولٰے و اختلافِ صُوَر خرد ز ہر گل و ہر نقش صد نشاں گیرد

من آنزماں کہ دمِ کیست آں مبارک دُم کہ وقتِ صبح دریں تیرہ خاکداں گیرد

چہ حالت ست کہ گل در چمن نماید روے — چہ آتش ست کہ در مرغِ صبح خواں گیرد

پھر گریز دیکھیے کہ کتنے بھولے انداز میں کیا گیا ہے۔ اس پر تو بڑے بڑے نکات قربان ہیں۔ لکھتے ہیں :-

کجاست ساقیِ مہ روی من کہ از سرِ مہر — چو چشم مستِ خودش ساغر گراں گیرد

پیام آورد از یار داز بپیش جامے — بہ شادیٔ رخِ آں ماہِ مہرباں گیرد

فرشتۂ بحقیقت سروشِ عالمِ غیب — کہ روضۂ کرمش نکتہ بر جناں گیرد

میرا خیال ہے کہ حافظ اگر کچھ نہ لکھتے اور صرف اس طرح کے چند قصیدے لکھ دیتے تو اُن کے کمالِ شاعری کے لیے کافی تھے۔ یہ قصیدہ شروع سے آخر تک نہایت لطیف تشبیہات واستعارات سے پُر ہے۔ اور اصل مدح صرف حقائق پر مبنی ہے۔ کہیں بے جا تعریف اور بھٹئی نہیں کی گئی اور اور متوسطین کی طرح گداگری بھی نہیں ہے۔ آخر میں دعائیہ کے لیے بھی صرف ایک شعر ہے اور حافظ کی قدر دانی کے لیے بھی صرف ایک ہی شعر میں اشارہ ہے۔ لکھتے ہیں :-

زمانِ عمر تو پایندہ باد کایں دولت — عطیہ الیست کہ در کارِ انس و جاں گیرد

خیالِ شاہی اگر نیست در سرِ حافظ — چرا بہ تیغِ زباں عرصۂ جہاں گیرد

ان اشعار سے خیال ہوتا ہے کہ حافظ نے ابو اسحٰق یا انجو کی حکمرانی کے اوائل میں یہ قصیدہ پیش کیا ہو گا۔ یعنی ۷۴۳ھ کے قریب یہ اشعار لکھے ہوں گے۔

ایک قصیدہ شاہ شجاع ابن مبارز الدین محمد ابن مظفر کی مدح میں ہے۔ اس کا زمانہ ۷۵۹ھ سے ۷۸۶ھ تک تھا۔ بڑا دیندار اور اوامر و نواہی والا حکمران تھا۔ حافظ نے متعدد غزلوں میں اُس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن قصیدہ ایک ہی ملتا ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

از پرتوِ سعادتِ شاہِ جہانیاں ۔۔۔ شد عرصۂ زمیں چو بساطِ ارم جواں

اس قصیدہ میں شروع ہی سے مدح ہے اور غائبانہ ہے اس مدح کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

شاہے کہ شد بہمتش افراختہ زماں ۔۔۔ ماہے کہ شد بطلعتش افروختہ زمیں

آنجا کہ بازِ ہمتِ او سازد آشیاں ۔۔۔ سیمرغ وہم را نہ بود قوتِ عروج

یہاں "افروختہ" اور "افراختہ" ـــ "زمیں" اور "زماں" کی رعایت بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ اسی طرح تجنیس مطرف "ماہے" اور "شاہے" میں بھی ہے۔

خطابیہ اشعار میں بھی صنایع و بدایع ہیں۔ مثلاً:۔

وے طلعتِ تو جانِ جہان و جہانِ جاں ۔۔۔ اے صورتِ تو ملکِ جمال و جمالِ ملک

یہاں ملکِ جمال، جمالِ ملک، جانِ جہاں اور جہانِ جاں خاص طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ لفظی اور معنوی رعایتیں بھی جگہ جگہ ہیں۔ مثلاً

گردوں نیاوردچو تو اختر بہ صد قراں ۔۔۔ ہرکاں نہ پرورد چو تو گوہر بہ ہیچ قرن

تا قصر زرد ساختی دلرزه او فتاد ‌ ‌ ‌ ‌ در قصر ہائے قیصر و در خانہائے خان

اسی طرح حافظ کا ایک قصیدہ منصور ابن محمد کی مدح میں ہے' جو ۷۸۹ھ میں حکمراں ہوا تھا۔ وہ قصیدہ سید حسن غزنوی کی تقلید میں فخریہ اور اسی زمین میں ہے۔ سید حسن نے جس "قصیدۂ فخریہ" کی ابتدا کی تھی اُس کا نام صفیر الضمیر تھا۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

داند جہاں کہ قرۂ عینِ پیمبرم ‌ ‌ ‌ ‌ شایستہ میوۂ دلِ زہرا و حیدرم

اس قصیدے پر مختلف شعراء نے قصیدے لکھے۔ مثلاً جمال الدین اصفہانی نے اپنا قصیدہ اس طرح شروع کیا ہے:-

اے طالع نکو ز تو تا کے قضا خورم ‌ ‌ ‌ ‌ وے مرغِ نیلگوں ز تو تا کے فرو پرم

مجیر بیلقانی کہتے ہیں:-

ہر شب کہ سر بہ جیب تفکر فرو برم ‌ ‌ ‌ ‌ ستر فلک بدرّم واز سدرہ بگذرم

اسی طرح کمال اسمٰعیل کہتے ہیں:-

روزے وطائے کحلی شب در بر آورم ‌ ‌ ‌ ‌ بگریز از جہاں کہ جہاں نیست درخورم

حافظ بھی اسی مشہور زمین میں منصور ابن محمد کی مدح میں کہتے ہیں جب کہ وہ اپنے وزرار کی رائے کے خلاف علمار و فضلا کو وظیفے دینے پر مصر تھا، قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

جوز اسحر نہاد حمائل برابرم | یعنی غلامِ شاہم و سوگند می خورم
ساقی بیا کہ از مددِ بخت کارساز | کامے کہ خواستم ز خدا شد میسرم
جامے بدہ کہ باز بشادیِ روئے شاہ | پیرانہ سر ہوائے جوانی است بر سرم

یہ صرف تین شعر "ساقی و جام" کے متعلق ہیں۔ حافظ نے دوسرے شعرا کی طرح بہت سے اشعار بہار اور شباب کے لیے نہیں لکھے بلکہ اس چیز کو انھوں نے غیر ضروری سمجھا۔ اور اختصار سے کام لے کر صرف تین اشعار پر اکتفا کیا۔ تیسرے شعر میں گریز اس بھولے انداز میں شروع ہوتا ہے کہ اس کی برجستگی کی داد دینی پڑتی ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں :-

راہم مزن بہ وصفِ زلالِ خضر کہ من | از جامِ شاہ جرعہ کشِ حوضِ کوثرم

حافظ نے حضرت خضر کے "آبِ زلال" پر حوضِ کوثر کے جرعوں کو ترجیح دی ہے، اور اپنے فضل و کمال کی معراج کے باوجود ممدوح کی غلامی کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں :-

شاہا من ار بہ عرش رسانم سریرِ فضل | مملوکِ ایں جنابم و مسکینِ ایں درم
من جرعہ نوشِ بزمِ تو بودم ہزار سال | کے ترکِ آبخور کند ایں طبعِ خو گرم؟

پھر مدح کو اس حد تک پہنچا دیتے ہیں کہ :-

عہدِ الستِ من ہمہ با مہرِ شاہ بود | در شاہ راہِ عمر ازیں عہد نگذرم

لیکن اس کے باوجود خوشامد اور بھٹئی نہیں کرتے، وہ کچھ

مانگتے ہیں تو صرف اس طرح کہ :-

غیر از ہوائے منزلِ سیمرغ بر سرم | بال و پرے ندارم و ایں طرفہ تر کہ نیست

یہ وہی مقام ہے جہاں انوری اور خاقانی جیسے باکمال شاعر بھی اپنے فن کی ناقدری دیکھتے ہوئے "گدائی" شروع کر دیتے ہیں۔ اور جو کام حافظ ایک شعر سے نکالنا چاہتے ہیں وہ ان کے متعدد اشعار سے بھی نہیں نکلتا۔ اور اگر حافظ کے کلام کا نفسیاتی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ کس طرح تھپکی دے کر اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں، کہ ممدوح بھی خوش ہو جائے اور بغیر کھلی ہوئی خوشامد کے کام بھی نکل آئے۔ دیکھیے کس خوبی سے ممدوح کے متعلق کہتے ہیں :-

اکنوں فراغت ست ز خورشید خاورم | بر من فتاد سایۂ خورشیدِ سلطنت

یعنی صرف ایک شعر میں اشارہ کر دیا گیا۔ اور اپنا ما فی الضمیر پیش کر دیا گیا۔ اس سے زیادہ کبھی کسبِ امداد کے لیے حافظ نے لب کشائی نہیں کی۔ اور اگر کبھی اپنے حالات سے مجبور ہو کر کچھ تقاضے کی ضرورت بھی پڑی تو صرف کنایے سے کام لیا ہے۔ مثلاً ایک قطعہ میں کہتے ہیں :-

دوش در خواب چناں دید خیالم کہ سحر | گذر افتاد بر اصطبلِ شہم پنہانی

بستہ بر آخور او استرِ من جو می خورد | توبرہ افشاند و بمن گفت مرا می دانی

ہیچ تعبیر نمی دانمش ایں خواب کہ چیست | تو بفرمائے کہ در فہم نہ داری ثانی

اسی طرح ایک مرتبہ بادشاہ نے وظیفوں میں کمی کر دی تو صرف ایک شعر میں کہتے ہیں :۔

آنکہ دہ با ہفت و نیم آورد بس سودے نہ کرد

فرصتت بادا کہ ہفت و نیم را دہ می کنی

یہاں صرف " فرصتت بادا " کہہ کر بڑے لطیف پیرائے میں کہتے ہیں کہ خدا کرے تجھے اضافہ کرنے کی مہلت اور فرصت مل جائے۔

غرضیکہ حافظ نے اپنے قصیدوں میں کئی نئی باتیں پیدا کیں، اول تو یہ کہ طول طویل قصیدوں سے گریز کیا۔ چنانچہ ان کے قصیدے اکتالیس شعر سے زیادہ کے نہیں ہیں۔ بل کہ "گیرد" والا قصیدہ ہی اتنے اشعار کا ہے ورنہ دوسرے قصیدے اس سے بھی کم تعداد کے ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ کہ انھوں نے تمہید میں بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ بہار و شباب کے متعلق چند شعر لکھے ہیں، اور گریز کی طرف آ گئے ہیں۔ تیسری چیز اُن کا لطیف گریز ہے، میرا خیال ہے کہ جس بھولے انداز سے اُنھوں نے گریز کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور اتنی برجستگی بہت کم دوسرے قصیدہ گو شعرا کے یہاں نظر آتی ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ حافظ نے اپنے قصیدوں میں ممدوح کی مدح میں اشعار زیادہ لکھے ہیں۔ لیکن ان میں بے سر و پا باتیں نہیں ہیں بل کہ محض حقائق نگاری کی کوشش کی ہے۔ پانچویں چیز یہ ہے کہ اُنھوں نے دعائیہ اشعار کو

طول نہیں دیا۔ اور نہ گدایانہ ابرام ہے۔ یہ اُن کی غیرت و خودداری کی بہت بڑی دلیل ہے۔ حال آنکہ ان سے پہلے انوری، ظہیر فاریابی اور خود سلیمان ساوجی وغیرہ نے کیا کچھ گدائی نہیں کی تھی۔ اور کیا کیا طریقے اختیار نہ کیے تھے۔ حافظ نے اگر کچھ مانگا ہے تو محض اشارے اور کنائے سے۔ یہ بہت بڑی خصوصیت ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر حافظ کے مقررہ اصول پر بعد کے قصیدہ گو شعرا نے عمل کیا ہوتا تو قصیدہ گوئی بھی ایک فنِ شریف کی حیثیت سے ہمیشہ کے لیے باقی رہتی اور اسے زوال نہ ہونے پاتا۔ بہر حال حافظ نے صرف قصیدوں ہی سے اپنی استادی اور کمالِ شاعری کو منوا لیا ہے اور یہی صنفِ سخن اُن کی بقا کے لیے کافی ہے۔

خیالِ شاہی اگر نیست در سرِ حافظ
چرا بہ تیغِ زباں عرصۂ جہاں گیرد

خلاصۃ الاخبار کا سالِ[1] تصنیف

پروفیسر براؤن[2] نے لکھا ہے کہ مشہور فارسی تاریخ روضۃ الصفا کے مصنف میر خواند[3] کے نواسے خواند امیر[4] (صاحب حبیب السیر وغیرہ) نے ۹۰۵ھ / ۱۴۹۹ع

---

[1] ناگ پور یونی ورسٹی جرنل (سالانہ) سنہ ۱۹۴۰ع۔ ترجمہ از انگریزی (ملخصاً)

[2] ادب فارسی در عہد تاتار" صفحہ ۴۳۴۔ انگریزی

[3] میر خواند کا نسب یوں ہے: محمد بن برہان الدین خاوندشاہ بن شاہ کمال الدین محمود بلخی ــ (دیکھیں مقدمۂ دستور الوزراء صفحہ ۱)

[4] خواند امیر کا نسب یوں ملتا ہے: غیاث الدین بن ہمام الدین بن جلال الدین بن برہان الدین محمد شیرازی (دیکھیں حبیب السیر طبع بمبئی سنہ ۱۸۵۶ع صفحہ ۲۔ مقدمۂ دستور الوزراء۔ تہران سنہ ۱۳۱۷ شمسی۔ صفحہ ۱۔

میں "خلاصۃ الاخبار" لکھی تھی۔ پروفیسر سعید نفیسی[1] نے بھی یہی لکھا ہے۔ اور اتنا اضافہ کیا ہے کہ وہ ۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء میں شروع کی گئی تھی۔ لیکن کتاب کے مطالعہ سے کچھ مختلف سنین کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے پاس جو[2] اس کا قلمی نسخہ ہے وہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

(ورق ۱-الف) برترین گوہرے کہ تاجدارانِ کشورِ فصاحت وتخت نشینانِ خطبۂ بلاغت را پیرایۂ افتخار باشد حمد و ثنائے یگانہ الیست کہ مراتِ عالم جلوہ گاہ بدایعِ قدرتِ اوست و وحدت کدۂ بیدار دلان خاص ترینِ خلوتِ او تصویرِ صور کائنات بر صفحۂ امکان از خانۂ ابداعش آرائشے است والوانِ صنایع بر لوحِ اکوان از کارگاہ اصطناعش نمایشے ..... نعتِ برگزیدہ الیست کہ صلائے دعوتش بہ برو بحر جہاں رسیدہ و جواہرِ ہدایتش در رشتۂ جانِ پاکاں کشیدہ و نسیم صبح سر بہ صحرا نہادہ، گیسوے عنبریں بوے اوست و گلِ سوری شعلہ بدل افتادہ روے

[1] مقدمۂ دستور الوزراء۔ صفحہ ۵۔

[2] یہ نسخہ بعد میں کتاب خانۂ حبیب گنج کو ہدیۃً بھیج دیا گیا ہے۔ اس کے نسخے بانکی پور، دیوبند، پنجاب یونیورسٹی، برٹش میوزیم میں بھی ہیں۔ بانکی پور والے نسخہ کی کتابت ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء میں ہوئی تھی۔ اور غالباً یہ نسخہ سب سے قدیم ہے۔

دلجوے او ...... و جواہر صلوٰتِ زاکیہ بہ آلِ امجاد و اتبۃ

اما بعد۔ بر ضمیر این حقیر گزشتہ کہ احوالِ پیشینان

و وقایع و سوانح عالم بنی آدم کہ از مبادی از من رشد

ہموارہ عمرِ عزیز را بمطالعہ کتبِ تواریخ و اخبار مصروف می داشت

و پیوستہ نظر بر صحائفِ حالاتِ سلف و لطائفِ روایاتِ

خلف می گماشت و چوں فی الجملہ وقوفے بر اخبار و اوضاعِ

عالم دست داد و اندک اطلاعے بر کیفیتِ سلوک طوائفِ

اُمم اتفاق افتاد احیاناً در مجلس عالی مقداری ......

(ورق ۱۰ ب) نظام الحق و الحقیقت والدین امیر علی شیر

خلد اللہ تعالےٰ ظلالِ معالیہ ....

بعضے از غرائب حکایات را بہ وجہ القا می کرد کہ ....

بہ شرفِ استحسانِ اقران می یافت و انوارِ عنایتِ آں حضرت

بر وجناتِ احوالِ ایں شکستہ بال می یافت و روز بروز

ایں صورت از دمتِ ازدیاد می گرفت و ساعت بہ ساعت

ایں حالت صفتِ استکمال می پذیرفت۔ (ورق ۱۲ ا)

تا در حال نہ صد و چہار از ہجرتِ نبی مختار صلی اللہ علیہ وسلم

...... کتاب ہاے مشتمل بر فنِ تاریخ و اخبار در کتب خانۂ

معمورۂ آن بزرگوار موجود بود تسلیم ایں بے بضاعت نمودند دبمطالعۂ آنہا ترغیب و تحریص فرمودند ومن بعد بندہ چوں براں مصنفات فصاحت آیات گزشتم و باخیار فوائدِ موفورہ ...... محظوظ وبہرہ ور گشتم ایں ہوس درسر وایں اندیشہ در خاطر پیدا شد کہ .... بعبارات روشن واشاراتِ مستحسن خلاصۂ آں فواید را درسلکِ بیان جمع آرم وچوں ایں خیال را بعرضِ آں نقطۂ دائرۂ فضل وکمال رسانیدم۔ بلفر قبول ورضا مقرون شد۔ رخصتِ انشاد ایں نامۂ نامی یافتم۔ وبجدِ تمام وجہد لاکلام از پے ترتیب ایں نسخۂ گرامی شتافتم۔ وبنا بر آں کہ ایں مختصر بر خلاصۂ اخبار اخیار مشتمل بود مرشدِ عقل آں را خلاصۃ الاخبار فی بیان الاحوال الاخیار نام نہاد وبیانِ حکایات و شرحِ روایاتش در ضمنِ مقدمہ و دہ مقال وخاتمہ اتفاق افتاد بدیں تفصیل کہ مذکور می گردد۔ **مقدمہ** در ذکر اول چیزے کہ خلعتِ خلقت پوشیدہ وبیان آنکہ حق سبحانہ' وتعالیٰ درہر روزے کدام شے را آفرید وکیفیتِ سلوکِ جاں ...... وحکومتِ ابلیس درمیانِ ایشاں۔ **مقالۂ اول**۔ در

ذکر انبیاء و مرسلین صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین۔ مقالۂ دوم
در ذکر حکماء رحم اللہ المؤمنین منہم۔ مقالۂ سوم در ذکر
ملوک عجم و سلاطینِ ماتقدم۔ مقالۂ چہارم در ذکر حالات
و غزواتِ خواجۂ کائنات و خلاصۂ موجودات علیہ افضل الصلوٰۃ
و اکمل التحیات۔ مقالۂ پنجم۔ در ذکر خلفای راشدین
(ورق ۷ب) و ائمہ اثنی عشر رضوان اللہ علیہم اجمعین۔
مقالۂ ششم۔ در ذکر خلفاے بنی امیہ۔ مقالۂ ہفتم
در ذکر خلفاے عباسیہ۔ مقالۂ ہشتم۔ در ذکرِ طبقات
سلاطین کہ بعضے معاصرِ عباسیاں و برخے بعد از ایشاں
بودہ اند۔ مقالۂ نہم۔ در ذکرِ فرزندان یافث بن نوح
علیہما السلام و بیانِ خروج چنگیز خاں و سلطنتِ اولادِ او
در اطرافِ جہان و اقطار۔ مقالۂ دہم در ذکر فرماے
دکشور کشاے بادشاہِ ظفر قرین صاحب قران امیر تیمور
گورکان و بیانِ سلطنتِ اولاد آں شہر یار گیتی ستاں
تا ایں زماں۔ و خاتمہ۔

مذکورۂ بالا اقتباسات سے حسبِ ذیل باتیں سمجھ میں آتی ہیں:-

(۱) حمد و نعت اور منقبت کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ اُسے سِنِ رشد سے کتب تاریخ سے دلچسپی تھی۔

(۲) مصنف کے ممدوح نظام الدین امیر علی شیر نوائی ہروی (۸۴۴ھ/۱۴۴۰ء تا ۹۰۶ھ/۱۵۰۱ء) کو بھی تاریخ کا ذوق تھا۔ اور ۹۰۴ھ/۱۴۹۹ء میں اُس نے اپنے کتب خانۂ خاص میں سے متعدد تواریخ اس مصنف کو عنایت کی تھیں اور اسی سے مصنف کو اپنی تاریخ خلاصۃ الاخبار فی بیان الاحوال الاخیار[1] کے لکھنے کی اجازت حاصل ہوئی تھی۔

(۳) مختلف کتابوں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی یہ کتاب صرف میر خواند کی روضۃ الصفا[2] تک محدود نہ تھی۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ خود روضۃ الصفا کی ساتویں جلد خواند میر نے مرتب کی تھی۔ اور وہ جو پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ یہ جلد تمام و کمال صرف ابو المغازی سلطان حسین (المتوفی ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء) کی حیات[3] اور واقعات کے

---

[1] اس کا ایک خلاصہ حمیدیہ لائبریری بھوپال میں ہے۔ ۱۱ر شوال ۱۰۷۹ھ (۱۴ مارچ ۱۶۶۹ء) اس پر تاریخ ہے۔ روضۃ الصفا جو لکھنؤ سے ۱۸۷۴ء میں شایع ہوئی تھی اُس میں بھی ساتویں جلد ہے۔ لیکن اس کے صفحہ ۱۳۶۰ کی آٹھویں سطر میں "محمد بن خاوند شاہ" سے پہلے "نواده" کا لفظ رہ گیا ہے۔ بانکی پور میں اس تاریخ کے کئی نسخے ہیں لیکن یہ ساتویں جلد نہیں ہے۔ کاما لائبریری بمبئی میں ساتویں جلد ہے لیکن اس میں دیباچہ نہیں، جس میں مصنف کا نام ہوتا ہے[2] بر اول جلد سوم

کے لیے دقت ہے، پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ اس جلد میں کم از کم ۹۲۹ھ / ۱۵۲۳ء تک کے واقعات ملتے ہیں۔ سلطان حسین کے اخلاف کے ذیل میں یہ مصنف لکھتا ہے :-

"در ذکر کیفیتِ حال و مآل میرزا بدیع الزمان و انتقالِ او از جہانِ پر ملال در شہر اسلام بعد خروج میرزا محمد زماں ولدِ او در جرجان۔ باز رشحاتِ سحابِ قلم و حرکاتِ بنانِ ستودہ رقم سابقاً بوضوح پیوست کہ چوں خاقانِ منصور علمِ عزیمت بصوبِ عالمِ آخرت بر افراشت ہفت پسرِ نیک اختر یادگار گذاشت ...... و ابو منصور مظفر حسین گورکان در استرآباد فوت گشت چنانچہ گذشت واو یک دختر داشت مسماۃ مہر انگیز بیگم۔ ہم دراں ایام کہ محمد خاں ہرات را فتح کرد، بحبالۂ نکاح عبید اللہ سلطان در آمد و چوں یک دو سال باوے بسر برد، من الجانبین بمفارقت اتفاق افتادہ۔ روے بخراسان آوردہ۔ حالا کہ تاریخ ہجری سنہ تسع و عشرین و تسعمائۃ رسیدہ ایں مستورہ بے آنکہ در تحتِ امر و نہی شوہرے شود در بعضے از بلادِ عراق روزگار می گزرانید۔"[1]

[1] روضۃ الصفا ۱۸۷۴ء لکھنؤ۔ صفحہ ۱۴۵۶۔

اس عبارت سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ یہ ساتویں جلد[1] کم از کم ۹۲۹ھ/۱۵۲۳ء تک ضرور جاری رکھی گئی۔ اور صرف ۹۱۲ھ/۱۵۰٦ء تک نہیں، جیسا کہ بداؤن کا خیال ہے۔

اب ہم خلاصۃ الاخبار کے سالِ تکمیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہمارے نسخے کے ورق نمبر ۴۰۴ ب میں خاتمہ سے پہلے یہ عبارت آتی ہے۔

"......... بر رائے انور وضمیر ضیا گستر ارباب فضل و ہنر پوشیدہ نماند کہ ایں نامۂ نامی و صحیفۂ گرامی را در اندک زمانے از کتب معتبرہ جمع آوردم و آنچہ در حیز قدرت ایں بے بضاعتِ عدیم الاستطاعت بود در تصحیح و تفحص سعی و اجتہاد کرد۔ و خلاصۃ الاخبار را بعبارتے کہ در بادی الرائے روے دارد در سلکِ بیان کشیدم

---

[1] اس ساتویں جلد کے علاوہ حبیب السیر (جلد سوم۔ حصۂ سوم۔ صفحہ ۳۲۹) میں اور خود خلاصۃ الاخبار کے ورق ۳۹۱ (الف۔ ب) میں پانچ جگہ خواندمیر نے میر خواند کے لیے "ابوی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مُلّا فیروز لائبریری بمبئی کی فہرست صفحہ ۸۱ میں خواندمیر کو میر خواند کا بیٹا کہا گیا ہے۔ اور سر الیٹ کی تاریخ جلد دوم صفحہ ۱۴۳ میں nephew کہا ہے۔

و از ایراد الفاظِ غیر مانوس الاستماع دامن در چیدم۔ اما
عالم السّر والخفیات آگاہ ہست کہ اگر نہ یمنِ اعتنا و حسنِ
اہتمامِ عالی حضرت خداوندگارے ہدایت شعارے بودے
آنچہ قرب شش ماہ نوشتہ شد در مدت شش سال باتمام
رسیدے ......"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

(۱) خلاصۃ الاخبار کئی "کتبِ معتبرہ" سے تیار ہوئی ہے۔

(۲) آخری سطر سے واضح ہے کہ یہ تاریخ چھ ماہ میں تکمیل کو پہنچی اور چونکہ وہ (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) ۹۰۴ھ/۱۴۹۹ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس لئے یہ قول صحیح ہے کہ وہ شعبہ ۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء میں مکمل ہوئی۔ بہر حال مذکورہ بالا عبارت تو خاتمہ سے پہلے کی تھی۔ اب اس خاتمہ کو ملاحظہ فرمائیں جو ورق ۵۰۴۔ الف۔ سے اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

در بیانِ مآلِ حالِ طائفہ آق قوینلو کہ ..... بعد از
فرقہ قراقوینلو کہ در آذربیجان و عراقین و فارس و کرمان بمرتبہ
بلندِ سلطنت رسیدہ اند۔ اگرچہ بیانِ احوالِ ایشاں را در حادثہ
و واقعہ سلطانِ سعید سلطانِ ابو سعید میرزا ذکر کردن اولیٰ و
انسب بود۔ اماں چوں ایشاں نیز با دشاہانِ عظیم الشان و

رفیع المکان بوده اند مناسب دید که از روحِ پُر فتوحِ استادان[1]
استمداد نموده مجملے در آخرِ ایں کتاب ثبت نماید......"

اسی تسلسل کے ساتھ یہ واقعات درج ہوتے ہیں۔ پھر ورق ۲۱۴۔الف
میں شاہ طہماسپ کی تاریخ ولادت آتی ہے۔ یعنی صبح چہارشنبہ ۲۶ ذی الحجہ ۹۱۹ھ
(مطابق ۲۸ جنوری ۱۵۱۴ء)۔ اس کے بعد ورق ۲۲۳ ب سے اس بادشاہ
(ابوالمظفر شاہ طہماسپ بہادر خاں صفوی) کی حکومت کا حال شروع ہوتا ہے
اور یہ کہ وہ اپنے باپ سلیمان کے انتقال (دوشنبہ[2] ۱۵ رجب ۹۳۰ھ = ۱۹ مئی ۱۵۲۴ء)
پر تخت نشین ہوا۔ کتاب کے آخری اوراق ضایع ہو گئے ہیں۔ تاہم ۹۳۰ھ تک کے حالات
ضرور پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر براؤن کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ یہ کتاب ۹۰۵ھ
میں لکھی گئی تھی۔

اسی دوران میں ہمارے مصنف نے دستور الوزرا، مآثر الملوک اور
حبیب السیر بھی لکھ لی تھیں۔ پھر ۹۳۱ھ/۱۵۲۵ء میں اس نے اپنی پانچویں کتاب آثار الملوک
والانبیاء لکھی اور ۹۳۴ھ/۱۵۲۸ء میں وہ ہرات سے ہندوستان آیا اور ہمایوں نامہ
لکھا۔ آخر ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء میں ۶۲ سال کی عمر میں انتقال کیا اور دہلی میں حضرت نظام الدین
اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے قریب دفن ہوا۔

---

[1] اسی نسخہ کے ورق ۳۸۲ ب میں مولانا معین الدین اسفزاری کو اور دستور الوزرا صفحہ ۴۱۱ میں مولانا جامی کو مصنف نے "مخدومی" لکھا ہے۔ [2] جنتری کے حساب سے دوشنبہ کی جگہ پنجشنبہ آتا ہے۔

توضیح مصطلحاتِ صوفیہ

برادرِ محترم پروفیسر عبدالحمید جالندھری کے یہاں ایک قلمی بیاض میں حضرت خواجۂ خواجگان بہاءالدین نقشبند قدس سرہٗ (م ۷۹۱ھ) کے مشہور خلیفہ حضرت محمد پارسا بخاری (محمد بن محمود) رحمۃ اللہ علیہ (م ۸۲۲ھ) کا ایک رسالہ موسومہ "توضیح مصطلحاتِ صوفیہ" نظر سے گزرا۔ اس کا ایک نسخہ کبھی خدا بخش لائبریری بانکی پور (پٹنہ) میں بھی دیکھا تھا۔ اور خیال ہے کہ یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

حضرت محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ[۱] چونکہ حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر خلفاء میں سے ہیں۔ اور اُن سے براہِ راست مستفیض ہیں۔

---

[۱] حضرت محمد پارساؒ کے حالات کے لیے جامیؒ کی نفحات الانس دیکھیں مطبع مجتبائی دہلی سے ایک مجموعہ جو چھ رسائل پر مشتمل ہے "رسائلِ ستّہ" کے نام سے شایع ہوا تھا اس میں حضرت محمد پارساؒ کا ایک رسالہ "قدسیہ" بھی شامل ہے۔

اس لیے اس رسالے کے مصطلحات جو کم از کم سلسلۂ نقشبندیہ میں آٹھویں صدی ہجری سے رائج تھے اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ ان کی مختصر اور جامع تعریف کے متعلق بہ ظنِّ غالب یہی کہا جا سکتا ہے کہ :-

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ‎ ‎ ‎ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اب یہاں وہ رسالہ پیش کیا جاتا ہے :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

توضیح مصطلحات صوفیہ بتحقیق خواجہ محمد پارسا علیہ الرحمۃ

کہ بیک واسطہ بحضرت بہاء الدین نقشبندؒ برسند۔

حرف الالف

امتزاج جلالیات وجمالیات را گویند۔ **اجازات** ادب واستیلاے الٰہی جل شانہٗ را گویند۔ **آشنائی** تعلق دقیقہ ربوبیت بود کہ باہمہ مخلوقات پیوستہ است چون تعلق خالقیت بمخلوقیت۔ **ایمان** مقدار انس را گویند بحضرت حق سبحانہٗ **اسلام** احوالِ مطابقت را گویند با نبیاء علیہم السلام **ابرِ حجابے** را گویند کہ مانع سبب حصول باشد **انگشت** صفتِ احاطہ را گویند **آزادی** مقام محو ذاتِ عاشق را گویند۔

حرف الباء موحدہ

بُت تجلّیِ شاہدِ معنی را گویند کہ بر صفتے ماوراے صفاتِ دیگر بر دلِ سالک ظاہر شود وہم مطلوب ومطلب را گویند **بیقیدی** طلبِ جستنِ حق را گویند۔

بیہوشی مقامِ طمس را گویند کہ محوِ صفات ہست۔ **بیگانگی** استغنائے عالمِ ربوبیت را گویند کہ بہیچ مقتضی نیست و بہیچ وجہ مشابہت و مماثلت ندارد۔ **بیابان** وقایع طریق را گویند۔ **باران** نزول رحمت را گویند **بناگوش** دقیقہ محبوب را گویند۔ **بازو** صفتِ مشیئت را گویند۔ **بندگی** مقامِ تکلیف را گویند **بیداری** عالمِ محو را گویند۔

حرف الباء فارسی

پیرِ مغان و پیرِ خرابات۔ کامل و مکمل را گویند ؎

ہر کو بخرابات نشد بیدین است
زیرا کہ خرابات اصولِ دین است

از خرابات خراب شدن صفاتِ بشریت باشد و فانی شدن وجود جسمانی و باقی آمدن بروحانی در اشعۂ لوز ذات کہ اصول دین از برائے آبادانیست کہ تا این خرابی دست نہ دہد وحقیقتِ آں ظاہر و پیدا نشود و آنچہ در گوہر آدمی پنہان گفتہ اند در خرابی پیدا شود، آنگاہ او بحقیقتِ خود بینا گردد و شرح دراز است و لائق ہرگونہ فہم نباشد۔ و گروہے کہ این معنی ندانند و حدیث زلف و دل و صنم شنوند بر الیشان انکار کنند و از احوالِ انیہا بے خبر بوند و ندانند کہ عالم معنی لطیف است و وجودِ روحانی مادام کہ از صورتِ مجرد نباشد بہ ادراکِ بصریِ ما نتواند رفت و بحسب اقتضائے معانی ہر معنی را صورتِ خاص یابد کہ بود

قایم باشد و مفہوم شود و مثال عینیہ در عالم کونی ازین قبیل دان۔ پس ازین جہت عارفان ہر معنی را بصورتے باز نمودند۔ و از ہر صورتے معنی خاص خواستند بدین طریق۔ مثلاً محبوب گویند و مراد از حق عز اسمہ باشد و قتیکہ مستغنی دارند او را از دوستی مطلقاً **پردہ** موانعے را گویند کہ میان عاشق و معشوق بود از لوازم طریق نہ از جہت ...... و عاشق را در معشوق در بازد۔ **پیچ زلف** اشغال الٰہی جل شانہ را گویند **پیام** اوامر و نواہی را گویند **پاکباز** توجہ خاص را گویند۔

حرف التاء فوقانی

ترسا مراد از مرد روحانیست کہ صفاتِ ذمیمہ و نفسِ امارہ او مبدل بصفات حمیدہ شدہ باشد۔ و دقائق حقائق را نیز گویند۔ **ترسا بچہ** واردِ غیبی را گویند **تکبّر** غرور دادن معشوق را گویند **توانائی** صفتِ فاعل مختار لیست **توانگری** جمیع صفات کمال بود **تاختن** شان اولو الامر الٰہی را گویند **ترک تاز** جذبۂ الٰہی را گویند کہ سالک مجاہدہ و رنج بسیار می کشد و کشادِ نمی یابد ناگاہ جذبۂ الٰہی جل شانہ در رسد و او را بمقصود رساند۔ **تاراج** سلبِ اختیار سالک را گویند **توبہ** باز گشتن از چیز ناقص و نازل را گویند **ترانہ** آئین محبت را گویند **تاب** انوار ذات را گویند۔

(حرف الثاء مثلثہ یافتہ نشد)

حرف الجیم تازی

جلال اظہار استغنائے معشوق است از عشق عاشق و آن دلیل نفیِ وجود و غرور عاشق بود و اظہار بے چارگیِ او بلقائے ظہور عاشق است چنانکہ عاشق را الیقین حاصل شود کہ اوست۔ جفا پوشانیدن دلِ سالک را گویند از معارف و مشاہدات کہ او را ابد انہا تربیتے کردہ اند جور باز داشتن سالک بود از سیر عروج جنگ امتحانات الٰہی جل شانہٗ را گویند جانان صفت قیومے را گویند کہ قیامِ جملہ موجودات با اوست کہ اگر آن دقیقہ پیوستہ بہ موجودات نبودے ہیچ جز در وجود بقا نیافتے جانفزا صفتِ لقا را گویند کہ سالک ازان صفت باقی ابدی گردد۔ جرعہ اسرار مقدمات را گویند کہ در سلوک از سالک پوشیدہ ماندہ بود جام احوال را گویند جلیس عالم طبعی را گویند

حرف الجیم عجمی

چشم و ابرو جمالِ الہام غیبی باشد کہ بر دلِ سالک وارد شود چشم پُرخمار شرم کردن راست از سالک لیکن کشف آں احوال نزد اہلِ کمال ظاہر است چشمِ ترک سِرِّ مراتبِ عالیہ را گویند کہ اہلِ کمال آنرا پوشیدہ دارند و جز خدائے را سبحانہٗ بر آں اطلاع نباشد چشم مست سِرِّ الٰہی را گویند بہ تقصیرے کہ از سالک در وجود آید۔ چہرۂ گلگون تجلیاتے را گویند کہ در غیر مادہ بود در خواب یا در حالت

بے خودی و بیداری **چوگان** تقدیر احکام را گویند نسبت بعاشق در راہِ عاشق۔

حرف الحاء حطی

حُسن جمعیت کمالات را گویند در یک ذات و آں جز حق را نباشد **حجاب** موانع را گویند کہ عاشق را از معشوق باز دارد بنوعے از انواعِ معاملۂ عاشق۔ **حبل المتین** عبارت از دست آویز نوعیت کہ کلامِ ربانی باشد **حضور** مقامِ وحدت را گویند **حج** سلوک اللہ را گویند **حلاوت** ظہورِ انوار را گویند کہ از راہ مشاہدہ حاصل آید مجرّد از مادّہ۔

حرف الخاء

خمّار و بادہ فروش پیر و مرشد را گویند **خشم** ظہورِ صفاتِ قہر را گویند **خُم** موقف را گویند **خَم زلف** اسرارِ الٰہی را گویند **خُمخانہ** عالمِ تجلیات را گویند کہ عالمِ قلب ست **خرابات** خرابیِ عالمِ بشریت است۔ **خالِ سیاہ** عالمِ نیستی را گویند **خطِ سیاہ** عالمِ غیب را گویند **خط سبز** عالمِ برزخ را گویند **خواب** فنائے اختیاری را گویند۔

حرف الدال مہملہ

دَیر و خرابات عالمِ معنی و باطنِ عارف را گویند کہ کامل باشد

دوستی سبقتِ محبتِ الٰہی راگویند بر محبتِ سالک دیدہ اطلاعِ الٰہی راگویند بر جمیع احوالِ سالک از خیر و شر۔ دین اعتقادے راگویند کہ از عالمِ تفرقہ سر بر کردہ بود۔ دف طلبِ معشوق راگویند دلدار صفتِ باسطی راگویند۔ دلکشا صفتِ فتّاحی راگویند دہان کوچک صفتِ متکلّمی راگویند۔ دست صفت قدرت راگویند دیوانگی مغلوبیت عاشق راگویند۔ (حرف الذال معجمہ یافتہ نشدہ)

حرف الراء مہملہ

روزِ شایع شب عالمِ غیبی عمر راگویند و عالمِ جبروت رانیز گویند و این عالمِ خطیست ممہّد میانِ عالمِ خلق و عالمِ ربوبیت۔ رُخ تجلیاتے راگویند کہ در مادہ بود۔

حرف الزاء معجمہ

زکوٰۃ ترک ایثار راگویند بانبیا علیہم السلام زُنّار یکجہتی و یکرنگی سالک باشد در راہ دین و متابعت راہ یقین زلفِ غیبتِ ہویت راگویند کہ کسے را بدو راہ نیست زندگی قبولِ طاعت و قبولِ اقبال محبوب راگویند۔ زد ریاضت و مجاہدہ راگویند۔

حرف السین مہملہ

ساغر و پیمانہ چیزے راگویند کہ در وے مشاہدۂ انوارِ

غیبی کنند وادراک معنی نمایند **ساقی و مطرب** فیض رسانندگاں
و ترغیب کنندگاں را گویند کہ بکشف رموز و بیان دلہائے عارفاں را معمور
دارند **سلطانی** جریان اعمال و احوال را گویند بر عاشق چنانکہ حکم و
ارادتِ الٰہی جل شانہٗ بود و امید ارادتِ خود را جاری کردن بود بر سالک۔
ساقی صورتِ مثالی جمالیہ را گویند **سماع** مجلس انس را گویند **سخن**
اشارہ و آشنائی را گویند بعالم غیب۔ **سخن شیرین** اشاراتِ الٰہی
جل شانہٗ را گویند بانبیاء بواسطہ وحی و باولیاء بواسطہ الہام **سیبِ زنخ**
مشاہدہ را گویند کہ از مطالعۂ جمال خیزد **ساعد** صفتِ قوت را گویند۔
سلام درود محمدی را گویند **سعادت** خواندنِ ازلی را گویند **سیم**
تصفیہ ظاہر و باطن را گویند **سوے** علاقہ را گویند بعالم حقیقت و مقام
جمع اول واکنوں در حالتِ تفرقہ افتادہ۔

حرف الشین معجمہ

شکل وجود ہستیِ حق را گویند **شیوہ** اندک جذبہ را گویند
و در بعضے احوال کہ گاہ بود و گاہ نبود **شوخی** کثرتِ التفات را گویند
باظہار صور افعال **شرابِ خام** عیش ممزوج را گویند کہ مقارنِ عبودیت
بود **شراب خانہ** عالم ملکوت را گویند **شمع نورانیہ** لوز و انوار
را گویند **شبِ قدر** بقاے سالک را گویند در عینِ استہلاک بہ وجود حق

شبِ یلدا انوار را گویند کہ سوادِ اعظم است شقاوت راندن ازلی را گویند.

حرف الصّاد مہملہ

صلح قبولِ اعمالِ عبادات را گویند۔ صراحی مقام را گویند

(حرف الضاد معجمہ یافت نشدہ)

حرف الطّاء مہملہ

طامات معارفے را گویند کہ در آدانِ سلوک بر دلِ سالک گزر کند۔ طرب انس با حق سبحانہٗ باشد و سرور دل دراں عیش، مدام حضور است با حق سبحانہٗ تعالیٰ (حرف الظاء معجمہ نیست)

حرف العین مہملہ

عاشق شیفتۂ جمالی و جلالِ الٰہی را گویند بعد از طلبِ او سبحانہٗ بحدّ تمام از آن روے کہ مستحق دوستی وے باشد و بس عید مقامِ جمع را گویند۔ علف شہوات و آرزوے نفس را گویند۔

حرف الغین معجمہ

غمزہ و بوسہ فیضے و جذبۂ باطن را گویند کہ بنسبت بسالک واقع شود غارت جذبۂ الٰہی جل شانہٗ، را گویند کہ بے واسطہ بدل رسد کہ بر سلوک و اعمال مقدم باشد و سالک مقہورِ آں بود اگرچہ او امر و اعمال

بر وجاری باشد **غمگسار** اثر صفتِ رحمانی را گویند کہ عموم و شمول دارد

نسبت بہ ہمہ موجودات **غمکدہ** مستوران را گویند۔

حرف الفاء

فریب استدراج الٰہی را گویند **فراق** غیبت را گویند از

مقامِ وحدت **فقیری** عدم اختیار را گویند۔

حرف القاف

قلاش و قلندر اہلِ ترک و مجرد را گویند کہ از مقامِ لذتِ

نفسانی گذشتہ باشد **قُوت** غذاے عاشق بود از دریافت جمالِ قدم کہ

ادراک ہیچ کس بدان محیط نشود **قدِ استوا** استیلاے الٰہی را گویند۔

قامت بیزاریِ پرستش را گویند کہ ہیچ کس را بجز از خداے سبحانہٗ

سزاوار نیست۔

حرف الکاف تازی

کمال اظہار کمالِ معشوق است جہت ترغیب و طلبِ عاشق۔

کینہ تسلط صفاتِ قہر را گویند **کلیسا** عالمِ حیوانی را گویند **کعبہ**

مقامِ وصلت را گویند **کلبۂ احزان** ہجرانِ محبوب را گویند **کباب**

پرورشِ دل را گویند در تجلیاتِ صوری۔ **کفر** ظلمتِ عالمِ تفرقہ

را گویند۔

حرف الکاف فارسی

گبر و کافر بچہ یکرنگی در عالمِ وحدت باشد کہ تمامیِ روے دل از ماسوی اللہ تاختہ در سوادِ نیستی جا گرفتہ باشد گیسو طریقِ طلب را گویند بعالمِ ہویت۔ گوہر معانی صفات و اسمار الٰہی را گویند۔

حرف اللام

لطف تربیتِ معشوق مرعاشق را برفق و مواسات تا قوتِ تاب آن جمال او را بکمال حاصل آید۔ لب کلام معشوق را گویند۔ لبِ لعل بطونِ کلامِ معشوق را گویند۔ لب شکریں کلامِ منزل را گویند کہ انبیاءؑ را بے واسطہ ملکؑ حاصل است و اولیار را بتصفیۂ باطن۔ لب شیریں کلام بے واسطہ را گویند۔

حرف المیم

میخانہ مراد از باطن عارف کامل باشد کہ دراں باطن شوق و ذوق و معارفِ الٰہی بسیار باشد۔ میکدہ قدمِ مناجات را گویند۔ محبوب و صنم حقیقتِ روحیہ را گویند در ظہور تجلی صورت صفاتی۔ مست و شیدا اہلِ جذبہ و شوق را گویند۔ مے ذوقے بود کہ از دلِ سالک بر آید و او را خوش وقت گرداند ملاحتِ بے نہایت کلامِ الٰہی را گویند کہ ہیچ کس بداں نہ رسد مہر باطنی صفتِ ربوبیت

راگویند۔ موے ظاہر ہوایت راگویند یعنی وجود راحہ ہمہ را ....(؟)
بمعرفت وجود علم حاصل ست۔ مشاھدہ تجلی راگویند مطرب
آگاہ کنندہ راگویند۔ مرأت تجلیات راگویند از معانی نوری وصوری
وتجلی بہ ذوقے منتہی گردد وھوالبقاء مع اللّٰہ سبحانہ ماہ روے
تجلیات صوری راگویند کہ سالک را بر کیفیات آں اطلاع واقع می شود۔
میدان مقام شہود راگویند مست خراب استغراق عاشق بود
درعشق محبوب۔

حرف النون

نقاب موانع راگویند کہ عاشق را از معشوق باز دارد بحکم ارادۂ
معشوق کہ عاشق راہنوز استعداد تجلی دست نداده نُقل کشفِ معانی را
گویند نوروز مقام تفرقہ راگویند ناقوس یادکرد ومقام تفرقہ را
گویند۔ نسیم وباد زور دعنایت راگویند نالہ مناجاتِ عاشق
راگویند بمعشوق۔

حرف الواو

وصال مقام وحدت راگویند وفا عنایت ازلی راگویند
کہ بے واسطۂ عمل خیزد۔

....

حرف الہاء و یاے تحتانی

ھجران التفاتے غیر را گویند ۔ یار و دلدار عالم شہود را گویند یاری صفت نصرت الہی را گویند کہ ضروری کافۂ موجودات است و ہیچ اسم موافق تر ازیں اسم نیست مر سالک را ۔ و عارف زیرک را، ایں جملہ کفایت باشد کہ در ہر عبارتے لوازم معانی را چگونہ رعایت باید کرد ۔

چند مشاہیر کے خطوط

ذیل میں چند مشاہیر کے خطوط پیش کیے جاتے ہیں جو راقم الحروف کے لیے بطور یادگار اور مایۂ صد افتخار ہیں۔ اور گو کہ تقسیم ہند کی افراتفری کی وجہ سے ایسے بہت سے خطوط ضایع ہو چکے ہیں۔ تاہم جو کچھ محفوظ ہیں وہ ایک بے مایہ مکتوب الیہ کے لیے ضرور بہت کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ اہل ذوق کو اُن سے بھی کوئی فائدہ حاصل ہو سکے۔

نواب صدر یار جنگ (ڈاکٹر) مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم —— [نواب صاحب حسن صورت اور حسن سیرت دونوں کے مالک تھے۔ زبردست عالم اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ متعدد علمی کتابیں اُن کی یادگار ہیں۔ اس عاجز کو بطور اولاد کے سمجھتے تھے اور ہمیشہ ہمت افزائی

فرماتے تھے۔ جمعہ ۱۱ر اگست سنہ ۱۹۵۰ء کو انتقال ہوا۔ اور حبیب گنج میں دفن ہوئے۔] افسوس کہ اُن کے صرف تین گرامی نامے محفوظ رہے ہیں۔

(۱) حبیب گنج۔ ضلع علی گڈھ۔

۲۶ر نومبر سنہ ۳۸ء

عزیز القدر سلمہٗ — السلام علیکم

کارڈ پہنچا۔ علالت پر تاسف، صحت پر مسرت ہوئی۔ ارادے کے تذبذب[1] کا حال پڑھ کر تعجب ہوا۔ جنھوں نے دوسرا مشورہ دیا ہے اُن کا خیال صحیح نہیں — ہرگز خیال نہ بدلنا۔ ورنہ ہمیشہ مشکلات سے گھبرا کر منھ موڑو گے۔ اور یہ زندگی کی شکست ہے۔ جو کام کر رہے ہو استقلال سے اللہ تعالےٰ پر بھروسا کر کے کیئے جاؤ۔ کامیابی مبارک باد دے گی۔ اپنی ہی یونی ورسٹی سے ڈگری لو۔

۔ سید حسن غزنوی پر مقالہ لکھنا مردانہ کام ہے۔ بس مرد بنو جیسے کہ ہو۔ کیا رام پور کے لوٗ درقوں میں کلام سے یہاں کا ذخیرہ مختلف ہے؟ غرشی صاحب کو

---

[1] سید حسن غزنوی پر کام کرنے کے لیے حبیب گنج اور ہندوستان کے بہت سے کتب خانے دیکھ چکا تھا۔ لیکن ایک فاضل نے اس کام کے لیے دقتیں بتائی تھیں اس لیے کچھ تذبذب پیدا ہو گیا تھا۔

نقل کے واسطے لکھتا ہوں۔

برٹش میوزیم اور انڈیا آفس سے عکس منگواؤ۔ کاربر آری کے بعد یہاں بھیج دینا۔ عکس کے مصارف بھیج دیے جائیں گے۔ اس طرح تمھاری محنت کی یادگار یہاں بھی رہے گی۔

میں دوبارہ کہتا ہوں کہ ارادہ نہ بدلنا۔

الحمدللہ خیریت ہے۔ سب کا سلام۔ عید مبارک۔

امید ہے کہ اب مزید قوت اور صحت حاصل ہوئی ہو گی۔ مکرمی مولوی عبدالقادر[1] صاحب کو سلامِ شوق۔ — حبیب الرحمٰن۔

(۲) حبیب گنج ضلع علی گڑھ۔ ۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء

گرامی قدر سلمہٗ

ابھی تمھارا مقالہ عزیز لکھنوی پر[2] پڑھ کر معارف ہاتھ سے رکھا ہے۔

---

[1] اس وقت راقم کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراؤتی (برار) میں لیکچرر تھا۔ خان بہادر مولوی عبدالقادر مرحوم وہاں مشہور وکیل اور بڑے مخیر بزرگ تھے۔ کل ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ایک مرتبہ اُنھی کی کوشش سے امراؤتی میں منعقد ہوئی تھی۔

[2] عزیز لکھنوی کے قصائد پر راقم کا مضمون معارف (اعظم گڈھ۔ نومبر ۱۹۴۵ء) میں شایع ہوا تھا۔ پھر نواب صاحب مرحوم کا یہ خط معارف (اعظم گڑھ۔ دسمبر ۱۹۴۵ء) میں شایع ہوا۔

حسبِ معمول خوش گفتی و درستی

ایک عجیب اتفاق ہے کہ عزیز کا ایک بہترین شعر، فارسی شعر کا بجنسہٖ گویا ترجمہ ہے:-

---

عزیز:-

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں　　　مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

خالص:-

در لفظ مدینہ دیدم از معجزہ ات عیاں　　　مہ شق شدہ گرفتہ دین را بہ میاں

——زندہ باش——　　　حبیب الرحمٰن

(۳) حبیب منزل - علی گڑھ -

۲۹ر جنوری سنہ ۱۹۴۹ء

گرامی قدر سلمہٗ

ابھی کارڈ پڑھا خوش ہوا ۔ ع

ای دقت تو خوش کہ وقت من خوش کردی

یہ محض وقتی بات نہیں ۔ جداً لکھتا ہوں کہ کسی موقع پر رخصت لے کر یہاں آجاؤ ۔ ہم باہم مل کر کتاب خانے پر نظر ڈالیں ۔ شاہجہاں کے عہد از نزدا پرنگاہ کرد ۔ ایک نایاب کتاب اور ذخیرہ یہاں موجود ہے ۔ ایک یادگار قائم ہو جائے ۔ اس پر غور کر کے جواب لکھو جہاں تک ممکن ہو مستعد ہو جاؤ ۔

۱

والد عاو ـــــ محمد حبیب الرحمٰن خاں

کراچی اسلامیہ کالج

بمطالعہٗ عزیز القدر غلام مصطفےٰ خاں سلمہٗ

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم

[علامہ کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ راقم الحروف پر خصوصی شفقت تھی ۔ کنگ ایڈورڈ کالج، امراوتی (برار) میں جب لیکچرر تھا اور بعد میں ناگ پور یونی ورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو ہوا تو علامہ مرحوم اکثر یاد فرماتے رہے اور اُن کے تعلق کے جو حضرات سی۔پی۔ کا دورہ فرماتے تو اُن میں سے اکثر کے ذریعے اِس عاجز کو سلام و پیام پہنچاتے تھے ۔ میں ۱۹۴۸ء کے شروع میں کراچی آیا اور علامہ مرحوم کو اپنے آنے کی اطلاع بھی نہ دے سکا ۔ جب وہ خود کراچی تشریف لائے تو ملاقات پر عین شفقت سے شکوہ کیا کہ "میری اجازت کے بغیر تم سی۔پی۔ سے کیوں چلے آئے ؟" افسوس کہ اس بے مثل بزرگ نے کراچی میں ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو انتقال فرمایا] ان کے چار خطوط محفوظ ہیں :۔

(۱) دار المصنفین اعظم گڈھ

مکرم السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ یکم دسمبر ملا تھا۔ مگر مجھے چند سفر درپیش تھے۔ اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔ آپ کا ارادہ اچھا ہے۔ امید ہے کہ آپ کی کوششوں سے ایک نئے شاعر سے ہم روشناس ہوں گے۔

ہمارے یہاں فارسی کا ذخیرہ بہت ہی کم ہے۔ اس لیے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔

(۱) حدیقۂ حکیم سنائی کے آخری تاریخی شعر میں "پانصد و بست و پنج" عموماً پایا جاتا ہے۔ اور بعض میں "پانصد و چہل و پنج" ہے۔ اور عام روایت کی بنا پر ۵۲۵ھ سنائی کی تاریخ وفات ہے۔ اور بعضوں کے نزدیک جس کی میں نے بھی تائید کی ہے ۵۴۵ھ تاریخ وفات قرار دی ہے۔ میرا مضمون سنائی کی تاریخ وفات پر معارف میں چھپا ہے۔ اس لیے "پانصد شصت و پنج" تو کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ دولت شاہ نے ۵۷۶ھ تاریخ وفات بالکل غلط لکھی ہے۔

(۲) آپ کے سامنے حدیقہ کا مطبوعہ یہی نسخہ ہے جو نولکشوری سے بھی زیادہ غلط ہے۔ یہی عبارت نولکشوری میں اس طرح ہے۔ "کتاب کتبہ الحی بغداد وارسل الی امیر الاجل برہان الدین جمال الاسلام ابو المحسن

علی بن ناصر الغزنوی الملقب بہ بریاں گر رحمۃ اللہ علیہ بسبب الطعن الطاعن فی ھذا الکتاب" اس عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ ابوالحسن علی امرار میں سے تھے، علمار اور شعرار میں سے نہ تھے۔ گو حدیقہ کے اشعار سے "سالار دین" ہونا ظاہر ہے "بریاں گر" الملقب ہونا بھی شرط ہے۔

دولت شاہ نے سید حسن غزنوی کو سنائی کے معاصرین میں شمار کیا ہے (صفحہ ۹۸ لندن) اور سید حسن غزنوی نے دولت شاہ کے مطابق ۵۳۵ھ میں وفات پائی ہے۔ (صفحہ ۱۰۵)

بغداد میں بزمانہ خلیفہ راشد باللہ المقتول ۵۳۲ھ سلطان مسعود بن محمد بن ملک شاہ نے سید حسن غزنوی سے ملاقات کی (دولت شاہ صفحہ ۱۰۵) سلطان مسعود بغداد میں ۵۳۰ھ میں تھا۔ اس بنا پر سنائی کے سید حسن غزنوی کے پاس خط بھیجنے کا وقت زیادہ سے زیادہ ۵۳۰ھ یا ۵۳۲ھ تک ہو سکتا ہے پھر آپ نے ۵۶۵ھ میں حسن غزنوی کا بغداد میں ہونا کس طرح قرین صواب قرار دیا ہے۔

طبقات ناصری صفحہ ۲۳ میں ہے کہ سید حسن غزنوی نے بہرام شاہ کی تخت نشینی پر یہ قصیدہ پڑھا "منادی بر آمد ز ہفت آسماں۔ کہ بہرام شاہ است شاہ جہاں"۔ اُس کی تخت نشینی ۵۱۱ھ میں ہوئی ہے۔ پھر وہ اُس وقت بھی تھا جب بہرام شاہ نے سلطان سوری کو شکست دی ہے۔ اور

قتل کیا ہے (لباب الالباب ۲ صفحہ ۲۷۶) خزینۃ الاصفیا صفحہ ۲۴۶ جلد اول میں جس

خواجہ ناصر الدین ابو یوسف کا ذکر ہے وہ سید حسن غزنوی کے والد نہیں ہو سکتے۔

خواجہ ابو یوسف چشتی مشہور صوفی ہیں اُن کے دو لڑکے ہیں۔ مودود چشتی اور ابو الفتح

چشتی۔ دیکھیے خزینۃ الاصفیا صفحہ مذکور سطر آخر۔ سلہ

(۳) شیخ آذری کی جواہر الاسرار ہمارے ہاں نہیں۔

(۴) ریاض الشعراء کا وہی مطلب ہے جو آپ سمجھے ہیں۔ یعنی صاحب

نے انتخاب میں اُس کو لیا ہے۔ والسلام

سید سلیمان ۲۷ دسمبر ۱۹۳۸ء

(۲) دارالمصنفین اعظم گڑھ

مکرم السلام علیکم

عنایت نامہ ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے پوری کوشش کی ہے

امید ہے کہ آپ ہمت نہ ہاریں گے۔ ایک بات عرض کر دوں کہ اکثر تکثیر مواد کے

لیے لوگ قیاسات کو دلائل کی جگہ دے دیتے ہیں۔ آپ اُس سے احتراز فرمائیے

جب تک کوئی بات محقق نہ ہو جائے قبول نہ کیجیے۔ اُس زمانے میں آداب د

سلہ سید حسن غزنوی پر کام کرنے کے سلسلے میں علامہ مرحوم سے استفادہ کیا تھا۔ ایک

بندی کو جو شبہات پیدا ہوا کرتے ہیں اُن کا ازالہ اس جواب میں ہے۔ پھر بفضلہ تعالیٰ اس شاعر پر

راقم الحروف کا مقالہ زیادہ بہتر طریقے پر تیار ہوا۔

القاب بے معنی کا بڑا کھیل تھا۔ .... تاج الدین اور عزالدین اور خدا جانے کیا کیا لوگ کہتے تھے۔ یہ نام نہیں ہیں۔ ان سے دھوکا نہ کھایئے۔

دولت شاہ میں تاریخیں اور واقعات بھی معتبر نہیں۔ ایک دلچسپ تذکرہ ہے اور بس۔ تاریخی حیثیت اس کو بہت کم حاصل ہے۔

میرا مضمون سنائیؒ کی وفات پر معارف مارچ ۱۹۳۳ء میں نکلا تھا۔

آپ کا خط واپس جاتا ہے۔ والسلام

سید سلیمان ۲۱ر جنوری ۱۹۳۹ء

(۳) دارالمصنفین اعظم گڈھ

مکرم السلام علیکم

عنایت نامہ کا شکریہ۔ ریواں کے کتبخانہ کی اطلاع کا شکریہ کیا اچھا ہوتا کہ یہ کتبخانہ دارالمصنفین کو مل سکتا۔ کیا آپ اس کی تحریک نہ فرمائیں گے؟ یہاں کے رفقاء ان کتابوں سے بہت کچھ فوائد اٹھا سکیں گے۔

مولانا شبلی مرحوم کا تبرکؔ نامہ پہنچا۔ محفوظ رہے گا۔

ؔ مولانا شبلی کا ایک خط مولانا رحمٰن علی کے نام ان کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ اُس کی نقل میں نے علامہ کو بھیجی تھی۔ وہ خط یہ تھا:۔

جناب مکرم مولوی رحمٰن علی خاں صاحب دام مجدہٗ۔ ممبر کونسل ریاست ریواں

تسلیم۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے جامہ کا رواج ہندوستان کے سوا (صفحہ ۲۸۱ پر)

مولانا رحمٰن علی صاحب کا تذکرہ علماء[1] بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔

اذیب صابر، فرید کاتب اور فخر الدین خالد ہروی میں سے کسی کا

فارسی دیوان یہاں نہیں۔

سوانح شبلی[2] جلد اول ختم ہو رہی ہے۔ والسلام

سید سلیمان ۴ر ستمبر ۱۹۴۰ء

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۰) اور کہیں نہ تھا۔ دولت عباسیہ، اندلسین، اتراک

کے لباس کا حال کتابوں میں ملتا ہے۔ وہ جامہ سے بالکل الگ ہے۔ یہاں اس

کا رواج غالباً اکبر کے عہد سے ہوا۔ لیکن کسی خاص حوالہ کا مجھ کو علم نہیں۔

آپ کی کتاب تذکرۃ العلماء کب تک تیار ہو گی؟

المامون چھپ رہی ہے۔ والسلام۔ ۲۶ر نومبر ۱۸۹۱ء۔

شبلی

[1] مولانا رحمٰن علی مرحوم نے ریواں ریاست کے قیام میں تذکرہ علماء اور

آداب احمدی وغیرہ کتابیں لکھی تھیں۔ ان کا بہت بڑا کتب خانہ وہاں موجود

تھا۔ اور خراب ہو رہا تھا۔ میں نے تحریک کی تھی کہ وہ کتب خانہ دار المصنفین

کو مل جائے لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔

[2] یعنی حیات شبلی جو علامہ کی تصنیف ہے۔

(۴) دارالمصنفین اعظم گڑھ

مکرم السلام علیکم

عنایت نامہ کے جواب میں تاخیر ہوئی۔ میں نے حسب ایمائے سامی مولوی عیاض علی[1] صاحب کی خدمت میں نیاز نامہ آج لکھا ہے۔ دیکھئے نتیجہ کیا ہو۔ آپ اور مولوی اختر حسین[2] صاحب اگر کوشش میں لگے رہیں گے تو کامیابی کی امید ہے۔

حیاتِ شبلی ابھی تک مسودہ کی صورت میں ہے مگر بحمد اللہ کہ قریب ختم ہے۔ چالیس برس کی قومی، علمی و تعلیمی و سیاسی احوال و سوانح کا یہ مجموعہ ہے۔

نقد و تبصرہ دوسرے حصہ میں ہوگا۔ یہ صرف سوانح اور خدمات پر مشتمل ہے۔ آئندہ سال یہ حصہ مطبع میں چلا جائے گا۔ انشاء اللہ

ایک کتاب[3] کا اشتہار بھیجتا ہوں۔ اگر اس کے دس پانچ نسخے آپ کی تحریک سے فروخت ہو جائیں تو میں ممنون ہوں گا اور آپ ماجور۔ والسلام

سید سلیمان۔ ۲۸ رمضان سنہ ۱۳۵۹ھ ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

---

[1] ریواں میں مولانا رحمن علی مرحوم کے صاحبزادے جن کی تحویل میں مولانا کا کتب خانہ ہے۔

[2] میرے دوست پروفیسر اختر حسین نظامی جو ریواں کالج میں ہیں۔ انھوں نے اس کتب خانے کیلیے کوشش کی تھی۔

[3] یعنی علامہ کی مختصر کتاب "رحمتِ عالم"۔

قاری ضیاء الدین احمد الٰہ آبادی علیہ الرحمۃ

وہ حضرت قاری عبدالرحمٰن مکی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید تھے۔ حافظ عالم اور قراءاتِ عشرہ تک کے قاری و مقری تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے گوشے گوشے میں اُن کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد پھیلے۔ بعض لوگوں کو شاید یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اجنہ میں سے بھی کئی اُن کے شاگرد تھے۔ اس کے باوجود وہ سادگی اور عجز کا مجسمہ تھے اور صحیح قسم کے متقی تھے۔ غیبت سے (آجکل کے فیشن کے خلاف) سخت نفرت تھی اور اپنی خامیوں پر نظر رکھتے ہوئے خاتمہ بالخیر ہونے کے لیے ہر کس و ناکس سے دعاء کراتے تھے۔ راقم الحروف کو علی گڈھ میں اُن سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ اور اُن کی ذاتِ بابرکات سے مستفیض ہونے کی توفیق رفیقِ حال رہی۔ خلاصۃ البیان (عربی) اور ضیاء القراءت (اردو) اُن کی مشہور و مقبول کتابیں ہیں۔ امروہہ، لکھنؤ، الٰہ آباد اور علی گڑھ میں کم و بیش پچاس سال تجوید و قراءت پڑھائی۔ لکھنؤ میں مولانا عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مدرسے کا نام انہی کی تجویز پر فرقانیہ رکھا تھا۔ اور وہاں کے یہ پہلے مدرس تھے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی دستار بندی انہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ جمعہ ۲۹، جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۹۰ھ (۲۵، جولائی سنہ ۱۸۷۳ء) کو پیدا ہوئے اور سہ شنبہ ۷، ربیع الآخر سنہ ۱۳۷۱ھ (۵، جنوری سنہ ۱۹۵۲ء) کو الٰہ آباد میں انتقال فرمایا۔ اِن کے لوحِ مزار کے لیے عرض کیا تھا۔

روضۂ کنز المعانی ۱، حفص التجوید والقراءات

۹۰ ۱۲ ھ ۱ ۷، ۱۳ ھ

حجت القراء، مولانا مولوی حافظ

۵۲ ۱۹ ء

قاری ضیاء الدین احمد صاحب + انار اللہ برہانہٗ

۱ ۷ ۱۳ ھ ۱ ۸ ۵

ضیاء الدین احمد بحر الطاف — کز دین پاک وجہ دہر ضیا گشت

۹۰ ۱۲ ھ ۷۳ ۱۸ ء

بہ تجوید و قراءت فوز عالم — بہ ورع و یاد فخر اولیا گشت

۷۱ ۱۳ ھ ۵۲ ۱۹ ء

ادب آموز از دو حفاظ و قراء — بہر تو انس و جن را مقتدا گشت

۷۱ ۱۳ ھ ۵۲ ۱۹ ء

بہ طبع جیدہ شمس الضحٰے بود — بہ ذہن قامعہ بدر الدجی گشت

۷۱ ۱۳ ھ ۵۲ ۱۹ ء

زموت العالم آں حق موت عالم — مطہر دین کامل بے ضیا گشت

۱ ۷ ۱۳

۵۲ ۱۹ ء

• قاری ضیاء الدین احمد علیہ الرحمہ کے صرف تین خطارہ گئے ہیں۔

جن میں سے ایک ناقص الآخر ہے۔

(۱) محب مکرم زید لطفہٗ۔ بعد سلام مسنون آں کہ محبت نامہ انتظار کی حالت میں پہنچ کر خوشی ہوئی۔ الحمدللہ اس وقت اس قابل ہوں کہ محبت نامہ کا جواب خود لکھ رہا ہوں۔ مضمونِ خط بتلا کر دوسرں کی تحریر سے میرا مافی الضمیر پورا ادا نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے قریب قریب تمام سے خط وکتابت بند کر چکا ہوں۔ تاہم آپ کے تعلق کی وجہ سے مجبوراً عزیزم حافظ مغیث الدین احمد سے جواب لکھا دیا تھا کہ جواب پہنچنے پر آپ کی خیریت تو معلوم ہو سکے گی۔ مکروہاتِ دنیوی سے بھاگنا تو اختیاری چیز ہے جو کہ صفتِ محمود ہے۔ الحمدللہ کہ آپ کے اندر یہ صفت موجود ہے۔ لیکن باوجود کراہتِ طبعی کے کبھی مکروہات میں پھنس جانا غیر اختیاری امر ہے جس کا غم نہ کرنا چاہیے کیونکہ امورِ غیر اختیاریہ کی پکڑ نہیں۔ البتہ یہ ایک قسم کا ابتلا اور امتحان ضرور ہے۔ مگر جب کراہتِ طبعی موجود ہے تو ناکامی کا اندیشہ نہیں تاہم ایسے مواقع میں اس کے دفعیہ کے لیے شب میں سوتے وقت ایک تسبیح یہ درود شریف

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعِتْرَتِهٖ بِعَدَدِ كُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّكَ"

پڑھ لینا۔ انشاءاللہ تعالیٰ مفید ہوگا۔ اور اس کی مداومت تو بہت ہی مفید ہے۔ جو عابد وزاہد سب سے الگ کسی جنگل میں شب و روز عبادت کرتا ہے اس سے وہ شخص افضل ہے جو اپنے اہل وعیال میں رہ کر سب کے حقوق ادا کرے۔

جب کہ اللہ پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی نہ ہو باقی خانگی معاملات میں فیصلہ ہمیشہ شریعت کے مطابق کر کے خوش ہونا چاہیے۔ کوئی خوش ہو یا ناخوش۔ کیونکہ ایک کا خوش رکھنا آسان ہے۔ ہر ایک اور سب کا خوش رکھنا مشکل ہے۔ لہٰذا علم اور برداشت کی ضرورت ہے۔ ورنہ برداشتہ خاطر ہو کر گھبرا جانا ضروری ہے۔ اللہ پاک تو اپنے سب بندوں پر بڑے مہربان ہیں اُن کی صفات رحیم و رحمان ہیں۔ آپ ذرا توجہ فرمائیں تو اُن کی مہربانیاں خوب خوب ظاہر ہوں گی: اور میں آپ کے مقاصد کے لیے برابر دعا کرتا رہتا ہوں آپ خود بڑے خوش قسمت ہیں کہ قرآنِ پاک سے آپ کو حظ حاصل ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالےٰ خود فرماتے ہیں۔ "اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔" قرآنِ پاک افضل الذکر ہے۔ میری ملاقات کے لیے آپ کا دل ضرور چاہتا ہو گا۔ کیونکہ میری حالت بھی یہی ہے۔ دل رابدل رہیست امسال باوجود قصد آپ اس طرف تشریف نہیں لا سکے۔ اور میرے بلانے کی اس درجہ کوشش کی کہ اگر میں تنہا سفر سے معذور ہوں تو آپ نے میرے ساتھ نورچشم قاری عصام الدین احمد[1] کو بھی مدعو فرمایا۔ اس سال تعطیل میں یہ خیال کر کے کہ بہ نسبت امراوتی کے جبلپور قریب ہے مکان سے میں الہ آباد تک تو گیا مگر شاید شدت گرمی وغیرہ کی وجہ سے جبلپور حاضر نہ ہو سکا اور فوراً امکان

---

[1] حضرت تھانوی صاحب کے بڑے صاحبزادے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہیں۔

واپس آیا۔ کیونکہ اُس وقت وہاں بھی شدید گرمی تھی۔ اب جی چاہتا ہے کہ ۱۵ اگست لغایت ۲۱ ستمبر رعایتی رخصت لے کر تنہا امراوتی حاضر ہوں۔ مگر یہ سفر لمبا ہے واپسی ٹکٹ کا بھی موقع نہیں کہ کسی کو اپنا رفیق سفر بناؤں لہٰذا چند امور دریافت طلب ہیں۔ الہ آباد سے امراوتی تک کون سا راستہ قریب اور بہتر ہے اور کس ٹرین میں سہولت ہوگی۔ تیسرے درجہ کا محصول کیا ہے۔ آپ کے وابستگان آپ کے پاس ہیں یا جبلپور میں۔ اِس کے علاوہ جو امور سہولتِ سفر کے لیے آپ کے خیال میں ہوں سب سے بواپسی ڈاک مطلع فرمائیں۔ کیونکہ انشاء اللہ تعالیٰ میں بشرطِ حصول رخصت ۱۵ اگست تک اپنے وطن روانہ ہو جاؤں گا۔ اور وہاں سے بعد انتظام سفر خرچ الہ آباد دو ایک روز قیام کر کے امراوتی حاضر ہوں گا۔ شاید اس:.....

(۲)

محب مکرم جناب قاری صاحب زید لطفہ'

بعد سلام مسنون آنکہ بفضلہ تعالیٰ یہاں خیریت ہے اور خیر و عافیت

لہ جب میں علی گڈھ میں پڑھتا تھا تو روایتِ حفص پڑھانے کے بعد حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ میں انشاء اللہ شاطبیہ پڑھا دوں گا۔ اس چند سال کے بعد میرے پاس خط آیا کہ میں نے شاطبیہ پڑھانے کا وعدہ کیا تھا۔ زندگی کا بھروسا نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مرجاؤں اور وعدہ رہ جائے۔ اس لیے خود آتا ہوں اسی مضمون کا وہ خط تھا۔ اس وقت قاری صاحب کی عمر ۷۰ سال ہو چکی تھی اور علی گڑھ سے امراوتی قریب نو سو میل کا فاصلہ تھا جو سنہ ۱۹۴۱ء میں انھوں نے طے فرمایا۔ سبحان اللہ!

آپ صاحبوں کی مطلوب۔ عرصہ ہوا کانپور میں محبت نامہ پہنچا تھا۔ الحمد للہ آپ سب مخلصوں کی دعا سے اللہ پاک نے نورچشم حافظ فقیہ الدین[1] احمد سلمہٗ ربہٗ کو صحت کاملہ عنایت فرمائی۔ آپ کے نسخہ مرسلہ کے قبل ایک مجرب نسخہ مجی سعید خاں صاحب نے بھی دیا تھا۔ جس کو میں نے علی گڑھ سے کانپور روانہ کر دیا تھا، جس کو حکیم صاحب نے بہت پسند کیا تھا۔ مگر چونکہ آخر میں نورچشم لفیض احمد کے والد عزیزم حکیم عزیز احمد[2] صاحب کا معالجہ شروع ہو چکا تھا۔ اور کانپور کے بڑے بڑے حکیموں نے عزیز موصوف کے نسخہ پر اتفاق کر کے کہا تھا کہ اگر صحت مقدر ہے تو اسی نسخہ سے صحت ہو جائے گی۔ کیونکہ علاوہ تپ کے تمام احشاء وغیرہ میں ورم آگیا تھا۔ اور اس نسخہ میں نجملہ شکایتوں کی رعایت تھی چنانچہ اس نسخہ کے استعمال سے بہت جلد آرام ہونا شروع ہوا۔ اور حکیم صاحب نے بقرعید سے قبل وطن جانے کی اجازت دی تب ہم سب نے بقرعید وطن میں کی۔ دوا پرہیز اب تک سب بدستور جاری ہے۔ آج نورچشم حافظ فقیہ الدین احمد سلمہٗ کا کارڈ وطن سے آیا ہے۔ لکھا ہے بفضلہ تعالےٰ اب تک بالکل اچھا ہوں۔ کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں معلوم ہوتی۔ صرف کمزوری ہے آپ لوگ بالکل اطمینان رکھیں فقط آپ صاحبوں کے اطمینان کے لیے ان کی تحریر لکھ دی ہے۔ اس وقت سے ابتک

---

[1] قاری صاحب کے پوتے اور قاری عصام الدین صاحب کے صاحبزادے۔

[2] قاری صاحب کے بڑے داماد۔ افسوس کہ اب وہ بھی نہیں۔

مجھ کو کچھ ایسی تفکرات کا سامنا رہا کہ آپ کا محبت نامہ اور محبی قاری ابرار صاحب[1] وغیرہ کے جس قدر خطوط آئے کسی کا جواب نہیں روانہ کر سکا۔ آج ۹ر جنوری کو سب سے پہلے آپ کا جواب لکھ رہا ہوں۔ مجھ کو محبی سعید خاں صاحب کے امراوتی جانے کا علم نہیں ہوا۔ کیونکہ میری روانگیٔ کانپور کے بعد وہ امراوتی گئے اگر وہ اپنے امراوتی جانے کا ارادہ مجھ سے ظاہر کرتے تو میں اُن کے ہمراہ آپ کے لیے شرح شاطبی وغیث النفع ضرور روانہ کر دیتا۔ خیر میں نے چند جگہ اس کی بابت لکھا تو سب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب انشاء اللہ تعالےٰ بمبئی میں ضرور مل جائے گی، جس کا پتہ حسب ذیل ہے۔" ابنائے مولوی محمد بن غلام رسول السورتی تجار الکتب جامع محلہ بمبئی ۳"

محبی سعید خاں صاحب امراوتی سے علی گڑھ ابتک نہیں آئے۔ اب شاید تعطیل محرم کے بعد آویں۔ کیونکہ ۱۹ لغایتہ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۲ء محرم کی تعطیل ہے۔ اس تعطیل میں میرا قصد بھی وطن جانے کا ہے۔ طلباء قرارت کلاس نے چاہا تھا کہ تعطیل محرم سے پہلے امتحان ہو جاوے مگر میں نے کہہ دیا کہ اس تعطیل کے بعد امتحان ہوگا۔ والسلام مع الاکرام ضیاء الدین احمد غفرلہ' از علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنگالی کوٹھی نمبر ۳۔ گھر میں بڑوں کو سلام چھوٹوں کو دعوات دلی۔ اگر سعید خاں صاحب سے ملاقات ہو تو سلام مسنون کہہ دیں۔

---

[1] قاری صاحب کے شاگرد۔

(۳۳) از ناچیز ضیاء الدین احمد ۔ علی گڑھ ۲۹، فروری سنہ ۴۰ء

محب مکرم جناب مولوی صاحب زید لطفہ'

بعد سلام مسنون آنکہ محبت نامہ مجھ کو الہ آباد میں وصول ہو گیا تھا۔ حضرت عموی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بابت جو کچھ جناب نے تحریر فرمایا بالکل درست ہے۔ میرے تو بزرگ ہی تھے جہاں جہاں خبر پہنچی سب کو بہت قلق ہے میں اپنی حالت کیا عرض کروں۔ جناب نے اُن کے وصال کی قطعہ تاریخ جو تحریر فرمائی ہے جس کے ہر مصرعہ سے تاریخ نکلتی ہے بہت عجیب ہے الہ آباد اور وطن میں اکثر بزرگوں اور احباب کو میں نے دکھایا کیونکہ آجکل مولانا مرحوم کا ہی تذکرہ ہر جگہہ پایا جاتا ہے آپ کی قطعہ الفاظ اور بندش کو سب نے پسند کیا خصوصاً علماء اور شعراء نے بہت زیادہ پسند فرمایا۔ اور سب نے نقل کر کے اپنے پاس رکھا۔ دوسرے شعراء نے بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا قطعہ تاریخ لکھا ہے۔ مگر مجھ کو حضرت سید صاحب قبلہ اور آپ کا قطعہ جس کو آپ نے بہت خلوص سے لکھا ہے بہت پسند ہے۔ لیکن

لہ حضرت قاری صاحب کے چچا مولانا منیر الدین احمد صاحب مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں مدرس تھے اور یگانۂ روزگار تھے اُن کے انتقال پر یہ قطعۂ تاریخ عرض کیا تھا:۔

حجتِ اسلام، فرقِ فرقداں	محسنِ دوراں، فقیہِ دین رفت
۵۸ ۱۳ ۶	۵۸ ۱۳ ۶
فاضلِ النحریر و تاجِ ہندیاں	ہادیِ تکوینِ بعلیین رفت
۴ ۱۹ ۶	۵۸ ۱۳ ۶
از جہانِ خستۂ وحشت فزا	قبلہ علامہ منیر الدین رفت
۴ ۱۹ ۶	۵۸ ۱۳ ۶

(باقی صفحہ ۲۹۱ پر)

سب سے پہلے ہمارے یہاں کے مشہور شاعر نوح صاحب نے قطعہ تاریخ لکھا تھا وہی پتھر پہ کندہ ہو کر مزار شریف پر نصب کر دیا گیا تھا جس کو اُن کے ایک مرید نے کندہ کر کے خود نصب کر دیا۔ لیکن آپ کے قطعہ کو قلوب میں جگہ ملی۔ میری اب ایسی حالت ہو گئی ہے کہ جب ہو سکا تب آپ کا اور مجی قاری ابرار صاحب کا جواب لکھ دیتا ہوں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا وصال دسمبر ۳۹ء یوم جمعہ کو ہوا۔ صدمہ میں مجھ سے ذرا تاخیر ہو گئی۔ اور آپ کے قطعہ لکھنے کا حال مجھ کو معلوم نہ تھا ورنہ سنہ عیسوی[1] ضرور لکھ دیتا۔ میں اپنے علاج اور مخدومہ چچی صاحبہ کی خدمت میں تعزیت کی غرض سے گیا تھا اُسی زمانہ میں قاری ابرار صاحب نے حیدر آباد سے اپنی شرح جزری اُردو اصلاح کے لیے روانہ کیا تھا۔ میں چند روز تک الٰہ آباد میں ان کی یہ شرح اُردو کامل کو دیکھتا رہا۔ چونکہ یہ شرح بہت مفصل اور اچھی ہے میں اس میں مشغول رہا اور اس کا کام پورا کر کے الٰہ آباد ہی سے روانہ کر دیا۔ اور اپنی حالت ایک ڈاکٹر صاحب کو جو میرے مہربان ہیں اُن سے سب مفصل مرض کا حال بیان کیا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ انشاء اللہ آپ کو آرام ہو جاوے گا۔ مگر چونکہ

(حاشیہ صفحہ ۲۹۰ سے پیوستہ) [1] بعد میں معلوم ہوا کہ سنہ ۱۹۴۰ء میں نہیں بلکہ دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء میں انتقال ہوا تھا۔ اس لئے عیسوی مصرعے اس طرح بدل دیے :-

ع جہبذا النحریر دلوز تاج دیں

ع زیں جہان خستۂ د ماتم سرا

مرض پرانا ہے[1] ایک عرصہ تک معالجہ کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد الہ آباد سے نسخہ اور دوا لے کر میں وطن چچی صاحبہ مکرمہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں بھی نورچشم قاری محب الدین احمد سلمہٗ[2] کی اردو شرح ضیاء القرارت بغرض اصلاح میرے ساتھ تھی۔ یہ شرح بھی بہت مبسوط اور اچھی ہے جس کی اصلاح سے میں آج فارغ ہوا ہوں۔ نورچشم موصوف نے پہلے قریب ایک سال کے ہوا شرح ضیاء القرارت اردو لکھ کر طبع کے لیے مطبع کانپور میں روانہ کیا تھا کاتب نے اس کی کچھ کاپیاں لکھ کر پوری شرح ضائع اور گم کر دیا تھا۔ اس وجہ سے نورچشم کو یہ شرح دوبارہ لکھنی پڑی۔ لیکن یہ شرح پہلی سے بہتر ہے انشاء اللہ چند روز میں اب یہ شرح طبع ہو جاوے گی۔ امید کہ آپ بھی اس کو پسند فرمائیں گے انھیں وجوہ سے اس مرتبہ بھی آپ کے محبت نامہ کے جواب میں مجھ سے بہت تاخیر ہو گئی امید کہ معاف فرمائیں گے۔ مرض کی وجہ سے میری طبیعت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اب مجھ سے کچھ ہو نہیں سکتا۔ یہاں تعطیل کلاں یکم مئی سے ۱۴؍ جولائی تک رہے گی۔ میں نے مارچ سنہ ء سے آخر اپریل تک کی

---

[1] حضرت قاری صاحب کو قرأت پڑھاتے پڑھاتے مدت سے تنفس کا مرض لاحق تھا۔

[2] حضرت قاری صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جو مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں ہیں۔ منجھلے صاحبزادے قاری مستجاب الدین احمد بنارس میں ہیں۔ انشاء اللہ سب بھائی حافظ قاری اور عالم ہیں۔

رخصت لے لی ہے۔ اس وجہ سے انشاء اللہ تعالےٰ پرسوں یوم شنبہ ۲ مارچ کو میں علی گڈھ سے اپنے وطن روانہ ہو جاؤں گا۔ وہاں کا پتہ ڈاکخانہ قصبہ نارہ Nara ضلع الہ آباد۔ اسٹیشن ریلوے سراتھو۔ آپ کے یہاں تعطیل کلاں کب سے کب تک ہے۔ والسلام ازجانب نورچشم قاری عصام الدین احمد سلمہٗ و نورچشم انیس احمد سلمہٗ سلام مسنون مہدی باد۔ انیس احمد میرے نواسے ہیں۔ امسال مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں ایف۔ اے کے پہلے سال میں پڑھتے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

(پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر تھے۔ پروفیسر براؤن بھی ان کی قابلیت کا معترف تھا۔ بڑے وسیع النظر فاضل اور بے نفس بزرگ تھے اور دین سے بہت شغف رکھتے تھے۔ اورینٹل کالج لاہور میں پرنسپل بھی تھے۔ ۲۱ مئی ۱۹۴۸ء کو دل کی حرکت بند ہونے سے انتقال فرمایا) اُن کا ایک ہی خط محفوظ ہے:-

---

سلہ کانپور کے محلہ پرانا ناچ گھر میں قاری صاحب کے بڑے داماد مولوی حافظ قاری حکیم عزیز احمد صاحب تھے۔ وہ اور اُن کے صاحبزادے انیس احمد دونوں اللہ کو پیارے ہوئے۔

اورینٹیل کالج لاہور

۱۲ ستمبر ۱۹۳۸ء مجبی۔ السلام علیکم۔

آپ کا ۱۴ اگست کا خط ملا۔ جواب میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ میں نے یہ خط کہیں احتیاط سے رکھا اور پھر بات ذہن سے اتر گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔

سید حسن غزنوی پر کام کرنے کو میں بہت مستحسن سمجھتا ہوں۔ لیکن مجھے خوف ہے کہ آپ کو ہندوستان میں رہ کر اُن کے دیوان کے اچھے نسخے دستیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے یورپ کی لائبریریوں میں بھی اس کے مستند اور قدیم نسخے موجود نہیں ہیں۔ اور اُن کی زندگی کے حالات کا فراہم کرنا تو اور بھی دشوار ہوگا۔

میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ اگر آپ کسی فارسی شاعر پر تھیسس لکھنا چاہتے ہیں تو کسی ایسے شاعر کو لیجیے جو ہندوستانی ہو۔ آپ کو اس پر مواد بآسانی مل سکے گا۔ ایسے شاعروں میں طالب آملی، قدسی۔ کلیم۔ علی حزیں منیر لاہوری۔ بیدل۔ فیضی وغیرہم ہیں۔ ان میں سے اب تک کسی پر کام نہیں ہوا۔ بلکہ ان کے دیوان بھی طبع نہیں ہوئے۔ صائب پر پنجاب یونی ورسٹی میں ایک شخص تھیسس دے چکا ہے۔ لیکن اس کا دیوان شایع کرنے کی بڑی ضرورت ہے،

اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ سید حسن غزنوی کو میں اہمیت نہیں

دنیا میں خود ان کا بڑا مداح ہوں۔ لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُن پر کام کرنے میں ایسی دشواریاں پیش آئیں گی جن کو زیر کرنا آسان نہ ہوگا۔

تھیسس کا مضمون معین کرنے کے بعد آپ جو امداد میرے امکان میں ہوگی بصد خوشی لے سکتے ہیں۔ والسلام

مخلص
محمد اقبال

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

[آپ الٰہ آباد یونی ورسٹی میں عربی اور فارسی کے صدر رہ چکے ہیں۔ اور ان دونوں مضمونوں کے علاوہ اُردو ادب کے بھی زبردست فاضل ہیں۔ لسانیات، صوتیات، فنِ املا، قواعد اور مأخذات وغیرہ علوم میں غیر معمولی تبحّر حاصل ہے۔ راقم الحروف اُن کی شفقتوں سے اکثر نوازا گیا ہے۔ اللہ پاک اُنھیں سلامت رکھے] اُن کے صرف دو خط محفوظ ہیں:۔

(۱) ۲۲ (۱) میو روڈ۔ الٰہ آباد

یکم فروری ۱۹۴۸ء

عزیز مکرم

آپ کا ۲۷ جنوری کا پوسٹ کارڈ ملا۔ آپ کے مصائب کی تفصیل معلوم کرکے بہت قلق ہوا۔ خدا آپ کو صبر دے۔ اور آپ کی

مرحومہ بیوی اور بچے کو جنت میں جگہہ دے۔ البتہ ناگ پور میں آپ کا جی نہ لگا ہوگا۔ لیکن میرے خیال میں آپ کو وہیں توقف کرنا چاہیے تھا۔ آخر اور بھی تو سیکڑوں بلکہ ہزاروں خاندان اُس صوبے میں ہیں۔ میں ۲۰ جنوری سے ۲۲ جنوری تک ناگپور میں تھا اور آپ سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہوا۔ کچھ حال بھی پورا پورا دریافت نہ ہو سکا۔

کراچی جا کر تلاش روزگار اُس شخص کے لیے بجا ہے جو بیکار ہو۔ آپ برسرکار ہیں۔ میری مخلصانہ رائے ہے کہ رخصت کے ختم تک آپ کو ضرور واپس آجانا چاہیے۔ اور اپنی خدمت کا جائزہ بلا تکلف لے لینا چاہیے تاکہ اپنے علمی ذوق کو جاری رکھ سکیں۔ والسلام

خیر اندیش ع صدیقی

مولوی عبدالحق صاحب اس وقت یہیں ہیں۔ میں نے آپ کا خط اُن کو دکھایا تو اُنھوں نے بھی وہی کہا جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ آپ کو دعا کہتے ہیں اور اصرار سے کہتے ہیں کہ آپ کو واپس آکر اپنے کام میں مشغول ہو جانا چاہیے۔

ملہ کچھ بے محل تو ہے۔ لیکن بطور یادگار کے اہلیہ مرحومہ کے لوحِ مزار کی تاریخیں یہاں درج کرتا ہوں :-

گورِ آمنہ بی بنت مولوی عبدالمجید خاں جبل پوری

(صفحہ ۲۹۷م)   ۶   ۱۹

(۲) ۲۲ (الف) میور روڈ الہ آباد ۲

۲۰ راکتوبر ۱۹۶۷ء

مکرمی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب

بہت دن سے آپ کو خط لکھنے کا ارادہ تھا جو آج پورا ہو رہا ہے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آج کل اردو کالج میں کام کر رہے ہیں۔ خدا آپ کو کامیاب بنائے۔

اپریل کے "اردو" میں "دریائے عشق کا ایک ماخذ" پر آپ کا مقالہ دیکھا۔ اس مثنوی کی خبر مجھے ہوئی تھی۔ دیکھنے کی خواہش کی تو معلوم ہوا کہ علی گڑھ سے دور چلی گئی۔ خیر چپ ہو رہا۔ آپ نے اچھا کیا کہ یہ مقالہ شایع کر دیا۔ مجھے بھی مثنوی مافیہ سے آگاہی ہوئی ....

.... اب ایک قضیۂ معکوس سے بحث کرنا ہے ——

(حاشیہ ۲۹۶) این غریب آمنہ چو کردہ سفر — سینہ شق نیز چشم پرنم گشت

غربت، اہمال ورنجگی اسقام — زیں شہادت سعید ومکرم گشت

صبح عاشورہ دیدہ پیرش رفت — وائے دل سوز جد آں غم گشت

روز جمعہ بخلد آمنہ شد — طوف آں چاردہ محرم گشت

بچگاں سہ زپشش بجنت قدمی — ہر یک اورا سہیم ہمدم گشت

ان اشعار کے ہر پہلے مصرع سے ۱۳۶۴ھ اور دوسرے مصرع سے ۱۹۴۷ء برآمد ہوتا ہے۔

"معارف" (اعظم گڑھ) میں آپ نے ایک مقالہ[1] شایع کرایا تھا۔ اُس میں میری نسبت مبالغہ آمیز توصیفی فقرے لکھے تھے۔ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان فقروں کو پڑھ کر مجھے بہت شرم آئی۔ آپ نے لطف و کرم کے جوش میں "امامِ فن" کا لفظ مجھ جاہل کے لیے استعمال کیا ہے۔ سوچیے تو کہ آپ نے یہ کیا کیا۔ مجھ پر نوازش فرمائی اور لفظ "امام" اور لفظ "فن" دونوں کی تحقیر و تضحیک کے روادار ہوئے۔ آپ سے یہ توقع نہ تھی۔ لفظوں کے معنوں میں ایسی ہی بے اعتدالیوں سے تنزل پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے معنوں کو بالآخر کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے کہ لوگ اندھے کو بصیر کہتے ہیں۔ ہمارے اہلِ قلم جب یہ راہ اختیار کریں گے تو ہمارے ادب اور ہماری ثقافت کا کیا حال ہونا ہے۔ آپ اہلِ قلم اور صاحبِ تصنیف ہیں۔ اس خصوص میں آپ کو بہت احتیاط سے کام لینا ہے۔ والسلام

ع صدیقی

---

[1] معارف (جون ۱۹۵۱ء) میں "اردو املا کی تاریخ" مضمون شایع ہوا تھا ـــ یہ ڈاکٹر صاحب کا انکسار ہے۔ ورنہ وہ حقیقت میں اُن اوصاف کے حامل ہیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب

بابائے اُردو سے راقم الحروف کو کچھ رازدارانہ مراسلت کا شرف بھی حاصل ہے۔ اب چند ایسے خطوط کی اشاعت بے محل نہیں رہی اس لیے وہ نذرِ ناظرین ہیں :-

۱۔ دریا گنج دہلی

۹ ستمبر ۱۹۴۶ء

مکرم بندہ۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ کا خط ملا۔ آپ کے کرم فرمانے سی۔ پی کی حکومت کی تعلیمی پالیسی اور ذریعۂ تعلیم کے بارے میں جس بڑے خطرے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ پچھلے واقعات اور ۲۴ راگست کی ناگپور کی کانفرنس کے مبہم جلسے کی روشنی میں صاف نظر آتا ہے۔

صوبۂ متوسط و برار کے مسلمانوں کے قومی جذبے اور جوشِ عمل کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے آپ کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کہ وہ اپنے لیے اعلیٰ تعلیم کی ایسی درسگاہیں قائم کریں جس میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہو۔ آپ کے صوبے میں مسلمانوں کی عددی اقلیت اور اُن کی اقتصادی پستی کے پیشِ نظر یہ خیال قریب قریب ناقابلِ عمل معلوم ہوتا ہے اور موجودہ حالات میں ہر صوبے

کے مسلمانوں سے بھی کسی معتدبہ امداد کی توقع نہیں ہو سکتی۔

ناگ پور میں اُردو کے حامیوں کے ایک مختصر مشورتی جلسے کے انعقاد کا خیال بہتر اور مناسب ہے۔ لیکن ملک جس خلفشار میں مبتلا ہے اُسے دیکھتے ہوئے شاید یہ اجتماع کام یاب نہ ہو سکے۔ میری رائے ہے کہ کچھ دن اور توقف کیا جائے یہاں تک کہ فضا سازگار اور حالات روبہ سکون ہو جائیں۔ بہ ہر حال جب کبھی آپ مجھے اس سلسلے میں یاد فرمائیں گے بے عذر حاضر ہو جاؤں گا۔

بہ طورِ خود بھی میں اس گتھی کے سلجھانے کی فکر میں ہوں اور جو تجویزیں میرے ذہن میں ہیں انھیں بروئے کار لانے کے لیے موقع اور محل کے مطابق سلسلہ جنبانی بھی کر رہا ہوں، اگر کوئی مفید نتیجہ نکلا تو آپ کو مطلع کر دوں گا۔

نیاز مند ـــ عبدالحق ـــ

(۲) ۱۔ دریا گنج۔ دہلی

۹ر ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء

مکرمی۔ تسلیم۔

آپ کا خط پہنچا اور غلام احمد حسن[1] صاحب کا بھی۔ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ قابلِ غور ہے۔ غلام احمد حسن صاحب نے جو تجویزیں پیش کی ہیں اُن پر عمل دشوار

---

[1] غلام احمد حسن صاحب تلے گاؤں دسامر (برار) کے ایک مخلص اور پُر جوش بزرگ ہیں مولوی عبدالحق صاحب کا پہلا خط دراصل انھی کے نام ہے جو میرے پاس محفوظ رہ گیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے۔ کیا سی۔پی۔ کے مسلمانوں میں اتنی سکت ہے کہ وہ اپنے کالج قائم کر سکیں، کیونکہ اس زمانے میں باہر سے کسی امداد کی توقع نہیں۔ میں نے اس کے متعلق ایک دوسری تدبیر سوچی ہے۔ اور اب کارروائی بھی شروع کر دی ہے۔ کچھ ہو جائے تو اطلاع دوں گا۔

اصطلاحاتِ علمیہ کے لیے جو آپ نے دوسرا نام پیش کیا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ صاحب اس کے بالکل اہل نہیں۔ آپ مہربانی کر کے ان کی بجائے ڈاکٹر سلیم الدین قریشی پروفیسر جامعۂ عثمانیہ کا نام لکھ بھیجیں۔ وہ سائنس کے پروفیسر ہیں اور اب کیمیکل وانڈسٹریل ریسرچ کے ڈائرکٹر ہیں۔ ایک مدت تک میرے ساتھ وضع اصطلاحاتِ علمیہ کی ترتیب میں شریک رہے ہیں اور رسالۂ سائنس کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔ وہ اس کام کے لیے سب سے بہتر شخص ہیں۔ جن صاحب کا آپ نے نام پیش کیا ہے وہ اس سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اور اُن کا کمیٹی میں ہونا کسی حال میں مفید نہ ہوگا۔

خیر طلب ــــ عبدالحق ــــ

(۳) ۱۔ دریا گنج۔ دہلی

۲۱ر ستمبر ۱۹۴۶ء

مکرم و مہربانِ من ــــ تسلیم

آپ نے اور غلام احمد حسن صاحب نے ناگپور یونیورسٹی کی تجویز کے

متعلق مجھے لکھا تھا۔ میں نے اس معاملے کو ایسی جگہہ اور ایسی ہستی کے سامنے پیش کیا کہ جس کا اثر سی پی گورنمنٹ اور یونی ورسٹی پر پڑ سکتا ہے۔ میں نے یونی ورسٹی کی تجویز کا ایک ایسا بدل بھی پیش کیا تھا جو اُن کے اور ہمارے دونوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں۔ وہ کارروائی لائیے تو ہم اس پر غور کریں گے۔

ان کا یہ کہنا صحیح ہے۔ میرا یہ کہنا قبول نہیں ہو سکتا کہ مجھے فلاں ذریعہ سے اطلاع ملی ہے۔ یا فلاں شخص نے مجھے لکھا ہے۔ لہٰذا مہربانی کر کے یونی ورسٹی کے اُن احکام یا اُس روئداد کی نقل بھجوائیے۔ جن میں یہ تجویز منظور کی گئی ہے۔ ایسی صورت میں مناسب کارروائی کر سکوں گا۔ جواب جلد آنا چاہیے۔

خیر طلب ـــــ عبدالحق ـــ

راقم الحروف کے پاس ان خطوط کے علاوہ مولانا احسن مارہروی مرحوم، پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم، پروفیسر ضیا احمد صاحب پرنسپل محمد شفیع صاحب اور افغانستان، ایران، مصر اور جرمنی وغیرہ کے بعض فضلاء کے خطوط بھی تھے جن میں سے کچھ باقی ہیں۔ اور اکثر ضایع ہو چکے ہیں۔

اشاریہ

مصنّف کی دوسری کتابیں

(۱) فارسی پر اردو کا اثر۔ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں عہدِ غزنویہ سے لے کر عہدِ مغلیہ تک کی فارسی میں پاکستان اور ہندوستان کی زبان وادب کے اثرات بڑی کاوش اور تحقیق سے بیان کئے گئے ہیں۔ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔

قیمت مجلد ایک روپیہ

(۲) سعید حسن غزنوی۔ یہ نہایت فاضلانہ علمی مقالہ ہے جو ایک ایرانی پروفیسر تقی مدرس رضوی کے اسی موضوع کے مقالے سے پہلے شائع ہوا ہے اور اس سے زیادہ اہم اور زیادہ وقیع ہے۔

قیمت سات روپے

(۳) تاریخ بہرام شاہ غزنوی۔ یہ تحقیقی مقالہ انگریزی میں ہے اور سلطان بہرام شاہ غزنوی کی ۴۱ سالہ حکومت کا جائزہ ہے۔ اس مقالے کی تیاری میں مشرق و مغرب کی تمام متعلقہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ علامہ پرنسپل محمد شفیع صاحب کا پیش لفظ بھی ہے۔

قیمت مجلد چار روپے۔

(۴) تحفۂ زواریہ۔ حضرت شاہ احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۷۷ھ) کے نایاب فارسی مکتوبات کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر صاحب نے مرتب کیا ہے۔ مسائلِ شریعت و طریقت کا نچوڑ ہے اور ادب و تاریخ کے لحاظ سے بھی اہم ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

(۵) حالی کا ذہنی ارتقاء۔ یہ ایک تحقیقی اور علمی مقالہ ہے جس میں ان تمام کیفیات و حالات کا جائزہ ہے جو حالی کی مختلف تصانیف پر وقتاً فوقتاً اثر انداز ہوئے ہیں۔ حالی پر ایسی جامع اور تحقیقی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔

قیمت مجلد صہ۔ غیر مجلد للعہ۔

(۶) فارسی کے قدیم شعراء۔ اس مجموعے میں اندقی، برہانی، معزی، عثمان مختاری، سنائی، عمادی، عبدالواسع جبلی، سوزنی، انوری، ابوالعلاء گنجوی، ادیب صابر، نجیب الدین جرباذقانی، وغیرہ قدیم فارسی شعراء پر تحقیقی مقالات ہیں۔ اور ان شعراء کے متعلق ایسی معلومات ہیں جو کسی کتاب میں موجود نہیں۔ یہ مقالات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں شائع ہو چکے ہیں۔

(زیرِ طبع)

ناشر: اعلیٰ کتب خانہ۔ ناظم آباد ۳ کراچی ۱۸ پاک